یکم و ۱۶ نومبر ۲۰۲۵ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۸ ۔ شمارہ نمبر: ۲۱۔۲۲

پندرہ روزہ

# معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمود الحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱۔۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

# معیشت پر مُتصرِّف عوامل

**Daniah Orkoubi**

ہم ایک ایسے دَور میں جی رہے ہیں جس میں دکھائی دینے والی طاقتوں سے زیادہ طاقتیں وہ ہیں جو بالکل دکھائی نہیں دیتیں۔ جو کچھ یہ نادیدہ طاقتیں کرتی ہیں، وہ وقت آنے پر بہت واضح دکھائی دیتا ہے اور ہم کچھ نہیں کر پاتے۔ دنیا بھر میں یہ تاثر عام ہے اور تیزی سے پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ ہم پر نادیدہ طاقتوں کی حکومت ہے یعنی ہم اگر چاہیں بھی تو اُن طاقتوں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ نادیدہ طاقتیں کیونکر معرضِ وجود میں آتی ہیں، یہ بھی سمجھنا بہت دشوار ہے۔ کبھی کبھی بہت کچھ بہت آسانی سے سمجھ میں آنے لگتا ہے مگر پھر کچھ ہی دیر میں سب کچھ پہلے جیسا ہو جاتا ہے۔

معاشی امور کے کلاسِکل مکتبِ فکر کے بانی ایڈم اسمتھ، اور بازارِ مال و زر کو کنٹرول کرنے والے اُس کے نادیدہ ہاتھ کے تصور سے ملٹن فرائیڈ مین تک (جو نو سرمایہ دارانہ مکتبِ فکر کا اہم فکری ستون ہے) ریاست کا کردار معاشی ریگیولیٹر تک محدود رہا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ریاست سے بھی طاقتور شخصیات اور گروہ ہیں جو معاملات کو اپنی مُٹھی میں رکھتے ہیں اور اپنی مرضی کے ریاستی فیصلوں کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

ساڑھے تین چار صدیوں کے دوران ریاست یا حکومت کا بنیادی کردار محض یہ رہا ہے کہ کھیل کے اصول طے کرے، معاشی منڈیوں کا نظم و نسق یقینی بنائے، استحکام برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کرے یا پھر واضح حد تک اِس پورے کھیل سے باہر رہے۔

یہ ماڈل جامع نہ تھا اور اِسے بہت سی کمزوریوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کبھی بھرپور کامیابی ہاتھ لگی اور کبھی شدید ناکامی۔ بہرکیف، دنیا بھر کے بڑے معاشی اداروں کے تجویز کردہ اصول اور قواعد حکومتوں کے لیے حوالوں کا ذریعہ بنے۔

## جھٹکوں سے محفوظ ماحول کی تلاش

غیر معمولی نشیب و فراز سے پاک معاشی اور مالیاتی ماحول میں سرمایہ دارانہ ماڈل نے غیر معمولی اور قابلِ ذکر کامیابیاں حاصل کیں۔ جب طلب و رسد کی قوتوں کو آزادانہ طور پر کام کرنے دیا گیا تب مصنوعات اور محنت کی منڈی میں توازن اور استحکام پیدا ہوا۔ اِس کے نتیجے میں افراطِ زر کو قابو میں رکھنا ممکن ہو سکا اور معاشی منصوبوں کی بنیاد کے وسیع ہونے سے روزگار کے مواقع بہت بڑی تعداد میں بہت تیزی سے پیدا ہوئے۔

معاشی قوتوں کو آزادی کے ساتھ کام کرنے دینا اِس اعتبار سے بھی بہت سُود مند رہا کہ جدت کا بازار گرم ہوا اور خوشحالی کا گراف بلند ہوا۔ اِس کے نتیجے میں صنعتی اور ٹیکنالوجیکل انقلابات کی راہ ہموار ہوئی اور یوں نئی دنیا معرضِ وجود میں آئی۔ ہم اِسی نئی دنیا کا حصہ ہیں۔

## معاشی ماڈل کی حدود

خیر، تاریخ ہمیں اِس معاشی ماڈل کی کمزوریوں کے درشن بھی کراتی ہے۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی کے گریٹ ڈپریشن سے ۲۰۰۸ء کے مالیاتی بحران تک بحرانی لمحات نے ہمیں باور کرایا ہے کہ معاشی منڈیاں اپنے طور پر اِس نظام کو نشیب و فراز کے مراحل سے محفوظ رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔

۱۹۳۰ء کی دہائی کے دوران کینیز ین مداخلت نے معیشتوں کو مکمل بربادی سے محفوظ رکھنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ۲۰۰۸ء میں بھی معیشتوں کو شدید بحرانی کیفیت سے بچانے اور مالیاتی حوالے سے بھرپور اعتماد دوبارہ پیدا کرنے میں حکومتی سطح کی مداخلت نے اپنے حصے کا کام بخوبی کیا۔ اِن بحرانی کیفیتوں اور مشکل لمحات نے بارہا ثابت کیا کہ ریاست کو معاشی امور میں محض ریگیولیٹر کا نہیں بلکہ ریسکیو ورکر کا کردار بھی ادا کرنا ہے۔

## ریاست مداخلت کا نیا دَور

اب ہم معاشی امور میں ریاستی مداخلت کے ایک ایسے دور میں داخل ہو رہے ہیں جو محض نظریاتی نوعیت کی نہیں بلکہ ضرورت کا پیدا کردہ ہے۔ سیاسی اور تزویراتی کشیدگی، نازک سپلائی چین اور ٹیکنالوجی کی سطح پر پائی جانے والی انتہائی نوعیت کی مسابقت نے عالمگیر سطح پر معاشی نقشوں کو نئے سِرے سے ترتیب دینا شروع کیا ہے۔ حکومتیں انتہائی حساس اور اہم ٹیکنالوجیز میں بہت بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کر رہی ہیں، توانائی کے حوالے سے معاملات کو قابو میں رکھنے پر بہت زیادہ توجہ دی جا رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ حکومتیں سیمی کنڈکٹرز اور دوسری بہت سی صنعتوں میں سرمایہ کاری کے

## اندرونی صفحات پر


- سوڈان کا مسئلہ کیا ہے؟
- نصف سوڈان پر قبضے کی داستان
- کیا کمپیوٹر ہمیں غلام بنالیں گے؟
- غزہ امن معاہدہ: امکانات اور خدشات
- ظہران ممدانی: دہلی کے بے گھر بچوں۔۔۔
- عوامی سیاست کا عوام کُش راستہ
- ایران آبی بحران کی زد میں
- دہشت گردی، ایک رُخ یہ بھی!




Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

ساتھ ساتھ مخصوص، اہم معدنیات کے حصول اور تحفظ کو قومی مفادات میں شمار کر رہی ہیں۔

بہت سے ترقی یافتہ ممالک میں بھی معیشت کی سُست روی نے حکومتی سطح پر بہت کچھ خرچ کرنے کی راہ ہموار کی ہے۔ یہ سرمایہ کاری بنیادی ڈھانچے، ہمہ وقت ڈیجیٹل رابطوں، مہارتوں اور جدت کے معاملے میں ہے۔

## سوال صرف طلب کا نہیں!

معاشی معاملات میں طلب کو برقرار رکھنا بھی ایک لازمی ضرورت ہے۔ حکومتیں اِس حوالے سے بھی اپنا کردار ادا کرتی رہتی ہیں تاہم فی زمانہ معاشی معاملات میں ریاستی یا حکومتی مداخلت کا بنیادی مقصد محض طلب کو مضبوط یا برقرار رکھنا نہیں۔ یہ تو مستقبل کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کا معاملہ ہے۔ حکومتیں اِس بات کو یقینی بنانا چاہتی ہیں کہ اُن کی معیشتیں اِتنی مضبوط ہو جائیں کہ مصنوعی ذہانت کے سامنے آجانے کی صورت میں پیدا ہونے والے چیلنجوں کا سامنا کرتے ہوئے میدان میں ڈٹی رہیں۔

کسی بھی قسم کی بڑی تبدیلیاں اپنے ساتھ بہت سے خطرات بھی لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ اِس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ جو حکومتیں ایک طویل مدت سے ریگیولیٹر کی حیثیت سے کام کرتی آئی ہیں، اب انہیں جدت طرازی کی راہ پر گامزن ہونا ہے۔ ایک بڑا چیلنج اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ مداخلت سے کوئی بڑا اثر پیدا ہو یعنی سرکاری خزانے سے خرچ کیے جانے کی صورت میں حقیقی تبدیلی رونما ہو، نہ کہ نااہلی اور خراب کارکردگی۔

جدت طرازی کی بنیاد پر کام کرنے والی کسی بھی حکومت کے لیے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ڈیٹا اور ٹیکنالوجی کو بہتر خدمات کی فراہمی کے لیے استعمال کرنا، بحرانوں کا بہت پہلے سے اندازہ لگا لینا اور ڈیجیٹل دَور میں غیر معمولی رفتار اور قطعیت کے ساتھ کام کرنے والی ریاست کی تشکیل۔

## اسمارٹ ٹیکنالوجیز

کووِڈ کے پیدا کردہ بحران نے ایک بڑی حقیقت کو نمایاں کر دیا۔ یہ کہ پہلے ہی سے دباؤ کا شکار ہونے والے حکومتی بجٹ بڑے پیمانے کی مستقل مداخلت کا سامنا نہیں کر سکتے۔ ٹیکنالوجی کی مہربانی ہے کہ حکومتوں کو اب کم خرچ میں بہت کچھ کرنے کی گنجائش مل رہی ہے۔ ذہین تر نظام، تیز ڈیلیوری اور حقیقی وقت کی بصیرت سے ہدایت یافتہ پالیسیاں درکار ہیں نہ مخالفانہ نوعیت کا ڈیٹا۔

## جدت کے اپنے اپنے ماڈل

ہر قوم کو اب جدت کے حوالے سے اپنا ماڈل خود تیار کرنا ہے۔ اُسے اپنی سکت اور تناظر کو ذہن نشین رکھنا ہے۔ دوسری طرف دورِ حاضر کے پیدا کردہ بحرانوں کا سامنا بھی کرنا ہے۔ حکومتوں کو ٹیکنالوجی کے حوالے سے نئی حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے خود کو اُس کے مطابق کام کرنے کے لیے تیار کرنا ہے۔

حکومتوں کو اب ترجیحات کے تعین کے معاملے میں غیر معمولی حاضر دماغی، بصیرت اور دلچسپی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ کساد بازاری کے دور میں کسی بھی معیشت پر مرتب ہونے والا دباؤ اسٹریٹجک دباؤ میں پیدا ہونے والی کیفیت سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ ہدف یہ نہیں ہونا چاہیے کہ زیادہ فنڈز مختص کیے جائیں بلکہ حکمرانی بہتر ہونی چاہیے۔ جدت کو بروئے کار لانے پر توجہ دی جانی چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ ڈیٹا اور مصنوعی ذہانت کو بھی موثر قیادت کے ٹُولز کے طور پر استعمال کرنا چاہیے۔

عشروں تک نجی شعبے اور آزاد منڈی کو طاقت بخشنے کے سرمایہ دارانہ تصور نے عالمگیر ترقی کی راہ ہموار کی ہے۔ تبدیلی کی رفتار میں اضافے کے ساتھ ساتھ اب معاملہ معاشی منڈی یا ریاست کا نہیں رہا۔ اب معاملہ یہ ہے کہ حکومتیں کس طور ٹیکنالوجی اور نجی شعبے کے ساتھ مل کر عوام کے لیے ڈھنگ سے کچھ ڈلیور کر سکتی ہے۔

آج کے قائدین کو گزرے ہوئے اَدوار کے بنیادی تصورات سے ہٹ کر، بہت آگے جا کر سوچنا ہوگا۔ اُنہیں ایسی حکومتیں قائم کرنے پر متوجہ رہنا ہوگا جو حالات پر بھرپور نظر رکھتی ہوں، ڈیجیٹل معاملات میں انتہائی نوعیت کی صلاحیت کی حامل ہوں، نتائج کا خاص خیال رکھتی ہوں اور ماحول ایسا ہو کہ سرکاری سطح کی مداخلت کنٹرول کے لیے نہیں بلکہ مزید ترقی کی راہ ہموار کرنے اور کاروباری اداروں کو زیادہ سکت کا حامل بنانے کے لیے ہوں۔ اکیسویں صدی میں حکمرانی کا اصل کام نادیدہ ہاتھ اور سخت گیر ریاستی ڈھانچے میں سے کسی کو منتخب کرنے کا نہیں بلکہ ڈیجیٹل مہارت کو احسن طریقے سے بروئے کار لانا ہے۔ اب حکومتوں کو گاڑی درست راہ پر چلانی ہے، کاروباری دنیا اور ریاستی مشینری کو زیادہ طاقتور بنانا اور ڈلیور کرنا ہے۔ (مترجم: ابوصباحت)

"Between the invisible hand and government intervention: Governing in the age of technology". ("The Globalist". Nov 5, 2025)


اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی تاسیس کے موقع پر

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی وقیع اور یادگار تقریر کتابی صورت میں

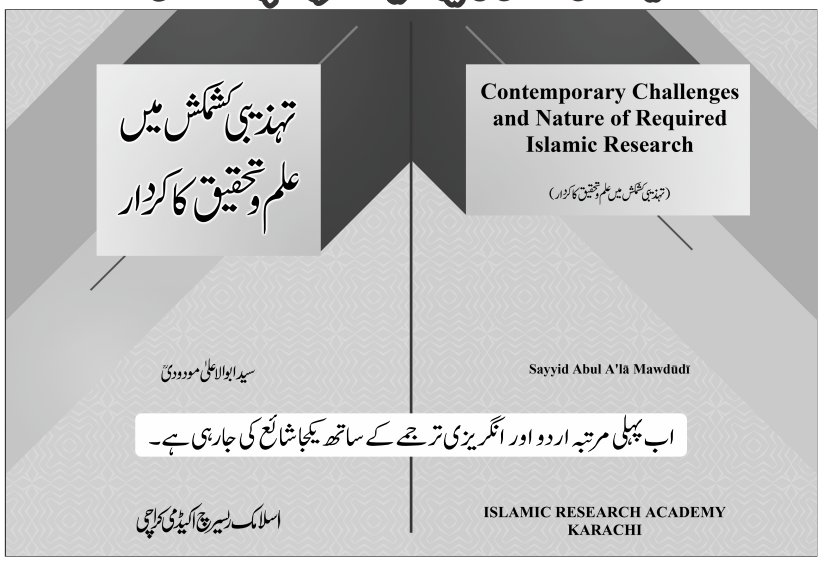


قیمت : صرف 300 روپے

خصوصی رعایت: 30٪

علمی، فکری اور تہذیبی کشمکش کے اس دور میں فکری اور دینِ اسلام کے سرمائے کی آبیاری کے لیے اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ دیگر کتب سے خود بھی مستفید ہوں اور احباب کو بھی اس کے لیے راغب کریں۔

ابھی طلب کیجیے! اکیڈمی بک سینٹر

ڈی۔۳۵، بلاک۔۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: ۳۶۳۶۸۰۲۰ (۲۱۔۹۲)

# سوڈان کا مسئلہ کیا ہے؟

ضیاء چترالی

سوڈان کا اصل مسئلہ آخر کیا ہے؟ یہ کیوں باہم دست وگریباں ہیں؟ حالانکہ سوڈان وہ ملک ہے جو کبھی افریقا کا اناج گھر (Food Basket of Africa) کہلاتا تھا، جس کی زمینیں دریائے نیل کے پانی سے سیراب ہوتیں، جہاں دنیا کا سب سے بڑا زرعی منصوبہ جزیرہ پروجیکٹ (Gezira Scheme) قائم تھا۔ یہی سوڈان سونے کے ذخائر کے لحاظ سے دنیا کا تیسرا بڑا ملک اور مویشیوں کی تعداد میں پانچویں درجے پر شمار ہوتا ہے۔ مگر آج وہی ملک بھوک، قحط، خانہ جنگی اور تباہی کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ اقوام متحدہ کے مطابق ایک کروڑ سے زائد سوڈانی اس وقت شدید غذائی قلت اور قحط کے دہانے پر ہیں۔ سوال یہ ہے کہ قدرتی وسائل سے مالا مال یہ ملک آج خاک وخون میں کیوں لت پت ہے؟

سوڈان کی موجودہ خانہ جنگی اپریل ۲۰۲۳ء میں شروع ہوئی، جب ملک کی دو طاقتور عسکری قوتیں آپس میں برسرِ پیکار ہوگئیں۔ ایک سوڈان کی پیشہ ور افواج (Sudanese Armed Forces - SAF) اور دوسری ریپڈ سپورٹ فورسز (Rapid Support Forces - RSF) جسے جنجواد بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لڑائی دراصل اقتدار، فوجی بالادستی اور ملک کے سیاسی واقتصادی وسائل پر قبضے کی جنگ ہے۔ جس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ ۲۰۱۹ء میں جب عوامی احتجاج کے نتیجے میں صدر عمر البشیر کی تین دہائیوں پر محیط حکومت کا خاتمہ ہوا، تو ملک ایک عبوری فوجی وشہری حکومت قائم ہوئی۔ لیکن جلد ہی طاقت کی کشمکش شروع ہوئی۔ آرمی چیف عبد الفتاح البرہان اور ریپڈ سپورٹ فورسز کے سربراہ محمد حمدان دقلو (حمیدتی) کے درمیان اقتدار کی تقسیم، فوج کے انضمام اور آئندہ حکومت کے خدوخال پر اختلافات نے ملک کو خانہ جنگی کی طرف دھکیل دیا۔ ابتدائی دنوں میں یہ لڑائی محض خرطوم (Khartoum) اور اس کے مضافات تک محدود تھی، لیکن جلد ہی یہ آگ پورے ملک میں پھیل گئی۔ خصوصاً مغربی خطے دارفور (Darfur) میں یہ لڑائی نسلی رنگ اختیار کر گئی۔ جس کے نتیجے میں دارفور کا شہر الفاشر (Al-Fashir)، جو کبھی امن کا مرکز سمجھا جاتا تھا، آج کھنڈر بن چکا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ آر ایس ایف ملیشیا پہلے فوج کا حصہ نہیں، بلکہ قبائلی مسلح جنگجوؤں کا ٹولہ تھی۔ ۲۰۱۹ء میں جب عمر البشیر کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو انہوں نے اپنی حکومت بچانے کے لیے اس کی حمایت حاصل کی اور اسے ایک نیم فوجی حیثیت دے دی۔ اس کے سربراہ حمیدتی کو سود ساختہ جنرل بنا دیا۔ اس کی ملیشیا کو ریپڈ سپورٹ فورس کا نام دیا گیا۔ اپریل ۲۰۱۹ء میں عمر البشیر کو جیل بھیج کر جنرل عبدالفتاح البرہان اور اس کے ساتھی فوجی افسروں نے اقتدار سنبھال لیا۔ انہوں نے ایک عبوری فوجی کونسل (Transitional Military Council) قائم کی۔ عوام نے اسے عارضی طور پر قبول کیا، مگر جلد ہی مطالبہ کیا کہ اقتدار سویلین حکومت کے حوالے کیا جائے۔ ملک بھر میں مظاہرے شروع ہوئے۔ ''قوۃ الحریۃ والتغییر'' (Forces of Freedom and Change – FFC) کے نام سے ایک اتحاد ابھرا، جس نے سویلین حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا۔ فوج نے پہلے مزاحمت کی، مگر پھر بین الاقوامی دباؤ اور داخلی احتجاج کے باعث اگست ۲۰۱۹ء میں ایک شراکتی حکومت پر اتفاق کیا۔ یہ حکومت فوج اور سویلین رہنماؤں پر مشتمل تھی۔

عبداللہ حمدوک وزیراعظم بنے، جبکہ جنرل البرہان فوجی سربراہ رہے۔ اس دور میں سوڈان نے عالمی سطح پر دوبارہ ر تعلقات بحال کیے، خاص طور پر امریکا سے اور ''دہشت گردی کی فہرست'' سے نام نکلوایا۔ پھر اکتوبر ۲۰۲۱ء میں جنرل البرہان نے اچانک بغاوت کر کے سویلین حکومت ختم کر دی۔ وزیراعظم حمدوک کو گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ فوج نے پورے ملک پر کنٹرول سنبھال لیا اور یہیں سے نئی خانہ جنگی کی بنیاد پڑ گئی۔ عبوری دور میں ریپڈ سپورٹ فورسز بھی ایک نئی فوجی طاقت بن کر ابھری تھی۔ یہ فورس پہلے دارفور کے جنگوں میں سرگرم رہی، مگر بعد میں اسے نیم سرکاری حیثیت دی گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ مستقل فوج اور اس ملیشیا کے درمیان اقتدار کی کشمکش بڑھتی گئی، خاص طور پر فوج میں انضمام (integration) کے معاملے پر۔ پھر اپریل ۲۰۲۳ء میں اختلاف کھلی جنگ میں بدل گیا۔ دارالحکومت خرطوم تباہ ہو گیا۔ الفاشر شہر میں بدترین نسل کشی جیسی صورت پیدا ہوئی اور ایک کروڑ سے زیادہ افراد بے گھر ہوگئے۔ گویا ۲۰۱۹ء میں عمر البشیر حکومت کا خاتمہ ''آزادی'' کی ایک امید تھی، مگر آج وہ امید ''انارکی'' میں بدل چکی ہے۔

باخبر ذرائع کے مطابق ریپڈ سپورٹ فورسز نے عام شہریوں کے قتل عام، لوٹ مار اور دیہات جلانے جیسے جرائم کیے ہیں۔ اس وقت فاشر شہر میں قتل عام جاری ہے۔ اس شہر پر سوڈانی آرمی کا قبضہ تھا۔ باہر سے ریپڈ نے شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ یہ محاصرہ ۶۰۰ دنوں سے جاری ہے۔ جس کے نتیجے میں مقامی لوگ مردار تک کھانے پر مجبور ہوئے۔ لیکن حال ہی میں سخت لڑائی کے بعد فوج کر پسپا ہو کر شہر خالی کرنا پڑا۔ جس کے بعد ریپڈ ملیشیا کے جنگجو شہر میں داخل ہو کر قتل عام شروع کر دیا۔ اسپتالوں میں لاشوں کا انبار اور بھوک سے تڑپتے بچوں کی المناک تصاویر سامنے آرہی ہیں۔

سوڈان کی اس خانہ جنگی میں بیرونی قوتوں کے مفادات ہیں۔

یہ ملک جغرافیائی طور پر بحر احمر (Red Sea) کے دہانے پر واقع ہے، وہی راستہ جو مشرقِ وسطیٰ، افریقا اور یورپ کی تجارتی شریان ہے۔ اسی محلِ وقوع نے سوڈان کو عالمی طاقتوں کے کھیل کا میدان بنا دیا ہے۔ متحدہ عرب امارات کھلے یا خفیہ طور پر ریپڈ سپورٹ فورسز کی مدد کر رہا ہے۔ اس کے فراہم کردہ ہتھیاروں کی کئی کھیپ فوج پکڑ چکی ہے۔ بلکہ ان ٹھوس شواہد کی بنیاد پر سوڈانی حکومت عالمی عدالت میں بھی یو اے ای کے خلاف مقدمہ دائر کر چکی ہے۔ یو اے ای کی دلچسپی سوڈان میں سونے کی کانوں، زرعی زمینوں اور بحری بندرگاہوں میں ہے۔ اماراتی کمپنیاں دارفور اور شمالی علاقوں سے سونا غیر قانونی طریقے سے برآمد کرتی رہی ہیں، جس کے بدلے ریپڈ کو اسلحہ اور مالی مدد ملتی رہی۔

دوسری جانب مصر سوڈانی فوج کی پشت پر کھڑا ہے، کیونکہ اسے خوف ہے کہ اگر نیم فوجی گروہ کامیاب ہو گئے تو اس کے لیے نیل دریا کے پانی کی تقسیم پر خطرہ بڑھ جائے گا۔ جبکہ سعودی عرب بظاہر ثالثی کی کوششوں میں مصروف ہے، مگر پسِ پردہ وہ بھی ایسے سیاسی انتظام کی خواہش رکھتا ہے جو اس کا ہمنوا اور تابع ہو۔

سوڈان میں روسی مداخلت بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ روس کا مقصد واضح ہے۔ وہ بحیرۂ احمر کے ساحل پر ایک مستقل بحری اڈہ (Naval Base) قائم کرنا چاہتا ہے۔ روس کی نجی قاتل کمپنی ''ویگنر گروپ'' (Wagner Group) پہلے ہی سوڈان کے سونے کی تجارت میں سرگرم رہی ہے۔

جہاں خانہ جنگی یا کشیدگی ہو، وہاں امریکا اور اسرائیل

کیسے پیچھے رہ سکتے ہیں۔ یہ بھی اس کھیل کے تماشائی نہیں بلکہ کھلاڑی ہیں۔ امریکا کا مفاد یہ ہے کہ سوڈان کسی صورت روس یا چین کے قریب نہ جائے، جبکہ اسرائیل جس کے ساتھ عمر البشیر کے بعد تعلقات کی بحالی کا عمل شروع ہوا، سوڈان کو مشرقی افریقا میں اپنا نیا اتحادی بنانا چاہتا ہے تاکہ بحیرۂ احمر میں ایرانی اثر و رسوخ محدود کیا جاسکے۔

اسرائیلی انٹیلی جنس نے ماضی میں ریپڈ کے قائدین سے براہِ راست رابطے کیے اور اطلاعات کے مطابق تل ابیب نے قاہرہ کے راستے دونوں فریقین پر اثر ڈالنے کی متعدد کوششیں کیں۔

سوڈان کی حالیہ خانہ جنگی میں ملک کی تقسیم کا خطرہ بھی بڑھ رہا ہے اور کئی مبصرین اسے ایک ممکنہ انجام کے طور پر دیکھ رہے ہیں، اگرچہ باضابطہ طور پر کوئی فریق تقسیم کا اعلان نہیں کر رہا۔ اس وقت شمالی اور مشرقی سوڈان (جس میں پورٹ سوڈان شامل ہے) فوج کے قبضے میں ہے۔ مغربی علاقے، خاص طور پر دارفور اور الفاشر پر آر ایس ایف کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اگر جنگ جاری رہی تو سوڈان دو یا تین حصوں میں تقسیم ہوسکتا ہے۔ شمال فوج کے زیرِ اثر ہوگا، مغرب حمیدتی ملیشیا کے قبضے میں اور مشرقی بندرگاہی علاقہ (Port Sudan) کسی بین الاقوامی نگرانی میں چلا جائے۔ گویا سوڈان آج صرف اقتدار کی جنگ نہیں لڑ رہا، بلکہ وجود اور بقا کی جنگ بھی لڑ رہا ہے۔ یہ ملک پہلے بھی جنوبی سوڈان اور شمالی سوڈان میں تقسیم ہو چکا ہے۔

اقوامِ متحدہ کے مطابق اب تک بارہ ہزار سے زائد افراد ہلاک اور چودہ لاکھ سے زیادہ بے گھر ہو چکے ہیں۔ ملک کے اسپتال تباہ، خوراک کی ترسیل بند اور پینے کا پانی نایاب ہو چکا ہے۔ الفاشر، نیالا اور الجنینہ جیسے شہر انسانی المیے کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ سونا، تیل، زمین اور اقتدار کے لیے لڑنے والے سرداروں کے درمیان پسنے والے عوام اب قحط اور بیماری سے مر رہے ہیں۔

ایک وقت تھا جب سوڈان کو ''افریقا کا مستقبل'' کہا جاتا تھا۔ زرخیز زمین، معدنی وسائل، وسیع مویشی فارم اور نیل کی برکتیں، یہ سب آج جنگ کے شعلوں میں بھسم ہو چکے ہیں۔ جہاں کبھی سبز کھیت لہراتے تھے، وہاں اب بارود کی بو ہے۔ جہاں کبھی کھجور کے درختوں کے سائے تلے بچے کھیلتے تھے، وہاں اب ماؤں کی چیخیں گونجتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مفادات کی اس جنگ کا اصل ایندھن غریب عوام کا خون ہے۔

●●●

# سوڈان کے دو شہروں میں قحط کی تصدیق

سوڈان کے جن علاقوں میں لڑائی کی شدت میں کمی آئی ہے وہاں غذائی تحفظ میں بہتری دیکھی گئی ہے جبکہ جنگ زدہ اور زیرِ محاصرہ علاقوں میں قحط پھیل رہا ہے۔

ملک میں بھوک اور غذائی قلت پر اقوام متحدہ کے ادارہ برائے اطفال (یونیسف)، ادارہ خوراک و زراعت (ایف اے او) اور عالمی پروگرام برائے خوراک (ڈبلیو ایف پی) کی نئی تجزیاتی رپورٹ کے مطابق، شمالی ڈارفر کے دارالحکومت الفاشر اور کادگلی میں قحط کی تصدیق ہو چکی ہے۔ ان علاقوں میں لوگ کئی ماہ سے خوراک اور طبی سہولیات تک قابل اعتماد رسائی سے محروم ہیں۔

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل انتونیو گوتیرش نے ملک میں میں فوری جنگ بندی کی اپیل کی ہے جہاں الفاشر اور دیگر علاقوں میں اجتماعی قتل عام کے لرزہ خیز مناظر آن لائن گردش کر رہے ہیں۔ گزشتہ ہفتے الفاشر پر 'آر ایس ایف' کا قبضہ ہونے کے بعد شہر میں امدادی کارکنوں سمیت سیکڑوں لوگوں کو ہلاک کر دیا گیا ہے جبکہ ہزاروں شہری اب بھی مشکل حالات میں پھنسے ہیں۔

سیکرٹری جنرل نے سوڈانی مسلح افواج اور باغی ملیشیا ریپڈ سپورٹ فورسز (آر ایس ایف) سے اپیل کی ہے کہ وہ اس ہولناک تشدد کو ختم کرنے کے لیے مذاکرات کی میز پر آئیں۔

## ۴۵ فیصد آبادی بھوک کا شکار

غذائی تحفظ کے مراحل کی مربوط درجہ بندی (آئی پی سی) کے مطابق، سوڈان میں تقریباً دو کروڑ ۱۲ لاکھ افراد یعنی آبادی کا ۴۵ فیصد اب بھی شدید غذائی قلت کا شکار ہے، تاہم اندازاً ۳۴ لاکھ افراد اب بحرانی بھوک کے درجے سے باہر آ گئے ہیں۔

یہ بہتری مئی سے اب تک ریاست خرطوم، الجزیرہ اور سینار میں ہونے والے تشدد میں کمی، حالات کے استحکام اور خاندانوں کی واپسیوں کے باعث دیکھی گئی ہے۔ ان علاقوں میں فصلوں کی کاشت کے لیے سازگار حالات کی توقع ہے جو کٹائی کے بعد اور اگلے سال تک برقرار رہیں گے اور جنوری تک بھوک کے بحران کا شکار افراد کی تعداد کم ہو کر ایک کروڑ ۹۳ لاکھ افراد تک رہ جانے کی امید ہے۔

تاہم، اقوام متحدہ کے اداروں نے خبردار کیا ہے کہ یہ بہتری محدود ہے۔ وسیع تر بحران نے ملک کی معیشت اور اہم خدمات کو تباہ کر دیا ہے اور وہ بنیادی ڈھانچا شدید نقصان یا تباہی کا شکار ہو چکا ہے جس پر لوگ انحصار کرتے ہیں۔

ملک کے مغربی علاقوں بالخصوص شمالی اور جنوبی دارفور کے علاوہ مغربی اور جنوبی کردفان میں شدید لڑائی جاری ہے۔ فروری سے بھوک میں اضافے کی پیشگوئی کی گئی ہے کیونکہ خوراک کے ذخائر ختم ہو جائیں گے۔

## محصور علاقوں میں قحط

جنوبی کردفان کے شہر دیلنگ میں بھی قحط جیسے حالات دکھائی دیتے ہیں لیکن قابل اعتبار معلومات کی کمی کے باعث وہاں کی صورتحال کو باضابطہ طور پر قحط قرار نہیں دیا جاسکتا۔ محصور علاقوں میں امداد کی رسائی محدود ہے اور تشدد بدستور جاری ہے۔

مغربی نوبا پہاڑیوں میں غذائی تحفظ کی صورتحال میں معمولی بہتری دیکھی گئی ہے لیکن اگر امدادی رسائی بہتر نہ ہوئی تو قحط کا خطرہ برقرار رہے گا۔ 'ایف آر سی' کے مطابق، دارفور اور کردفان کے پورے خطوں میں مزید ۲۰ فیصد علاقے قحط کا شکار ہو سکتے ہیں۔ یہ صورتحال ایسے وقت سامنے آ رہی ہے جب جنگ سے متاثرہ علاقوں میں ہیضے، ملیریا اور خسرہ جیسی بیماریاں تیزی سے پھیل رہی ہیں۔

(بحوالہ: ''نیوز ڈاٹ یو این ڈاٹ او آر جی''۔ ۴ نومبر ۲۰۲۵ء)

## بقیہ: کیا کمپیوٹر ہمیں غلام بنالیں گے؟

کیا ایسی کسی بھی صورتِ حال سے بچنا ممکن ہے؟ اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ ٹیکنالوجی کی ترقی کا عمل جس رفتار سے جاری ہے اس کا نتیجہ وہی نکلے گا جو یہاں بیان کیا جا رہا ہے۔ یاد رکھیے کہ انٹرنیٹ نے صرف تین عشروں میں ہمیں پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ ہمیں اس سیارے پر زندگی بسر کرتے ہوئے ہزاروں سال ہو چکے ہیں جبکہ انٹرنیٹ بہت نئی سی چیز ہے مگر پھر بھی وہ زندگی کے ہر معاملے میں ہم پر اپنے اثرات مرتب کر رہی ہے۔ اپنے طور پر کام کرنے والے سوفٹ ویئرز کی اس وقت بھی کوئی کمی نہیں۔ جب یہی سوفٹ ویئرز انسان کے جسم میں نصب ہو کر پوری قوت سے کام کریں گے تو انسان کا اپنے وجود پر بھی کوئی اختیار شاید باقی نہ رہے گا۔ یہ سب کچھ کتنے عشروں میں ہوگا، کچھ کہا نہیں جاسکتا تاہم جب تک ایسا نہیں ہوتا، ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم انسان ہیں، مشین نہیں۔

(مترجم: ایم ابراہیم خان)

(www.exitmundi.nl)

## سونا، کرائے کے فوجی اور متحدہ عرب امارات کی حمایت: اونٹوں کا بیوپاری

# نصف سوڈان پر قبضے کی داستان

ایلکس ڈی وال

'حمیدتی' کے نام سے مشہور محمد حمدان دگولو سوڈان کے سیاسی منظرنامے پر ایک طاقتور شخصیت کے طور پر ابھرے ہیں اور ان کی نیم فوجی تنظیم، ریپڈ سپورٹ فورسز (آر ایس ایف) اس وقت ملک کے نصف حصے پر قابض ہے۔

حال ہی میں آر ایس ایف نے ایک اہم فتح حاصل کی جب اس نے الفاشر شہر پر قبضہ کر لیا جو کہ دارفور کے مغربی خطے میں سوڈانی فوج اور اس کے مقامی اتحادیوں کا آخری مضبوط قلعہ تھا۔

اپنے مخالفوں کے لیے خوف اور نفرت کی علامت حمیدتی، اپنے حامیوں کے نزدیک جرات، بے رحمی، اور ایک بدنام ریاست کو منہدم کرنے کے عزم کی وجہ سے قابلِ ستائش ہیں۔

حمیدتی کا پس منظر نہایت سادہ ہے۔ ان کا خاندان شتر بانوں کی محاریہ شاخ سے تعلق رکھتا ہے۔ محاریہ اونٹ پالنے والے اور عربی بولنے والے رزیقات قبیلے کا حصہ ہیں اور یہ چاڈ اور دارفور کے درمیان آباد ہیں۔

حمیدتی کی پیدائش ۱۹۷۴ء یا ۱۹۷۵ء میں ہوئی۔ دیہی پس منظر رکھنے والے بہت سے لوگوں کی طرح ان کی تاریخِ پیدائش اور جائے پیدائش سرکاری طور پر درج نہیں کی گئی۔

ان کے چچا جمعہ دگولو کی قیادت میں ان کا قبیلہ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جنگ سے بچنے اور بہتر چراگاہوں کی تلاش میں دارفور منتقل ہوا، جہاں انہیں سکونت کی اجازت مل گئی۔

نوجوانی میں ہی تعلیم ترک کرنے کے بعد حمیدتی نے اونٹوں کی تجارت کے ذریعے روزی کمانا شروع کیا، وہ اپنے اونٹ لیبیا اور مصر تک بیچا کرتے تھے۔

اس وقت دارفور سوڈان کا بیابان مغرب سمجھا جاتا تھا جو کہ پسماندہ، بے قانون اور عمر البشیر کی حکومت کی عدم توجہی کا شکار علاقہ رہا ہے۔ عرب جنگجو، جو 'جنجاوید' کے نام سے جانے جاتے تھے، مقامی فُر قوم کی بستیوں پر حملے کرتے تھے۔ ان کے گروپ میں جمعہ دگولو کی قیادت میں ایک لشکر بھی شامل تھا۔

### مکمل بغاوت

تشدد کے اس سلسلے نے ۲۰۰۳ء میں ایک مکمل بغاوت کی شکل اختیار کر لی، جب فُر جنگجوؤں کے ساتھ مسالیت، زغاوہ اور دیگر قبیلوں نے بھی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ ان کا کہنا تھا کہ ملک کی عرب اشرافیہ نے انہیں نظر انداز کر رکھا ہے۔

جواب میں بشیر نے جنجاوید ملیشیا کو بڑے پیمانے پر پھیلایا تاکہ بغاوت کچلی جا سکے۔ ان ملیشیاؤں کی دیہات جلانے، لوٹ مار کرنے، قتل و غارتگری کرنے اور خواتین کی بے حرمتی کرنے پر بہت بدنامی ہوئی۔

حمیدتی کا دستہ بھی ان میں شامل تھا۔ افریقی یونین کے امن دستوں کی ایک رپورٹ کے مطابق، نومبر ۲۰۰۴ء میں ان کے دستے نے عدوانامی گاؤں پر حملہ کر کے اسے تباہ کیا، جس میں ۱۲۶ افراد مارے گئے، جن میں ۳۶ بچے بھی شامل تھے۔

امریکا کی ایک تحقیق کے مطابق جنجاوید نسل کشی کے مرتکب ہوئے۔ دارفور تنازع بین الاقوامی فوجداری عدالت (آئی سی سی) کو بھیجا گیا، جس نے چار افراد پر فردِ جرم عائد کی، جن میں بشیر بھی شامل تھے، جنہوں نے نسل کشی کے الزامات سے انکار کیا۔

حمیدتی ان بہت سے جنجاوید کمانڈروں میں سے ایک تھے جو اس وقت استغاثہ کی نظر میں چھوٹے درجے کے سمجھے گئے۔

صرف ایک شخص، یعنی جنجاوید کے 'کرنلوں کے کرنل' علی عبدالرحمٰن کُشیب کو عدالت میں پیش کیا گیا۔

گزشتہ ماہ انہیں ۲۷ الزامات کا مرتکب قرار دیا گیا، جن میں جنگی جرائم اور انسانیت کے خلاف جرائم شامل تھے۔ اب انہیں ۱۹ نومبر کو سزا سنائی جائے گی۔

۲۰۰۴ء میں تشدد کے عروج کے بعد کے برسوں میں، حمیدتی نے چالاکی سے اپنے پتے کھیلے اور ایک طاقتور نیم فوجی قوت، کاروباری سلطنت اور سیاسی مشین کا سربراہ بن گئے۔

ان کی کہانی موقع پرستی اور کاروباری ذہانت کی کہانی ہے۔ انہوں نے مختصر وقت کے لیے بغاوت کی، اپنے سپاہیوں کے لیے تنخواہیں، ترقیاں اور اپنے بھائی کے لیے سیاسی عہدے کا مطالبہ کیا۔ بشیر نے زیادہ تر مطالبات مان لیے اور حمیدتی دوبارہ حکومت کے ساتھ ہو گئے۔

### سونے کی کانوں پر قبضہ

بعد میں جب دیگر جنجاوید دستوں نے بغاوت کی، تو حمیدتی نے حکومتی افواج کی قیادت کی اور انہیں شکست دی۔ اسی دوران انہوں نے دارفور کی سب سے بڑی سونے کی کان 'جبل عامر' پر قبضہ کر لیا۔ جلد ہی، حمیدتی کے خاندانی کاروبار 'الجنید' نے سوڈان کے سب سے بڑے سونے کے برآمد کنندہ کا اعزاز حاصل کر لیا۔

۲۰۱۳ء میں حمیدتی نے ایک نئی نیم فوجی تنظیم، ریپڈ سپورٹ فورسز (آر ایس ایف) کی سربراہی کے لیے سرکاری حیثیت حاصل کی۔ یہ فورس براہِ راست البشیر کو جواب دہ تھی۔

جنجاوید کو آر ایس ایف میں شامل کر لیا گیا، انہیں نئی وردیاں، گاڑیاں اور اسلحے دیے گئے اور باقاعدہ فوج کے افسران بھی ان کی مدد کے لیے تعینات کیے گئے۔

آر ایس ایف نے دارفور کے باغیوں کے خلاف ایک اہم فتح حاصل کی۔ اگرچہ جنوبی سوڈان سے متصل نوبا پہاڑوں میں اس کی کارکردگی کمزور رہی تاہم اس نے لیبیا کی سرحد کی نگرانی کا ٹھیکہ حاصل کر لیا۔ بظاہر ان کا مقصد افریقا سے یورپ کی جانب غیر قانونی نقل مکانی روکنا تھا، مگر حمیدتی کے کمانڈرز بھتہ خوری اور انسانوں کی سمگلنگ کے لیے بھی جانے گئے۔

۲۰۱۵ء میں سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات (یو اے ای) نے سوڈانی فوج سے یمن میں حوثیوں کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے فوجی بھیجنے کی درخواست کی۔ اس دستے کی قیادت ایک جنرل عبدالفتاح البرہان کے پاس تھی، جو اب آر ایس ایف سے برسرِ پیکار سوڈانی فوج کے سربراہ ہیں۔

حمیدتی نے موقع دیکھا اور سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات دونوں سے علیحدہ علیحدہ معاہدہ کیا کہ وہ انہیں آر ایس ایف کے کرائے کے فوجی فراہم کرے گا۔ ابوظہبی سے اس تعلق نے حمیدتی کے لیے گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ اماراتی صدر محمد بن زاید کے ساتھ ان کے قریبی تعلق کی ابتدا تھی۔

نوجوان سوڈانی ہی نہیں بلکہ ہمسایہ ممالک کے افراد بھی نقد رقم کے لالچ میں آر ایس ایف کے بھرتی مراکز کا رخ کرنے لگے، جہاں انہیں شامل ہونے پر چھ ہزار ڈالر تک ملتے تھے۔ حمیدتی نے روس کے ویگنر گروپ کے ساتھ بھی شراکت داری کی، جس کے بدلے میں انہیں اپنے فوجیوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ تجارتی فوائد، خصوصاً سونے کے کاروبار میں حاصل ہوئے۔

انہوں نے معاہدے کو حتمی شکل دینے کے لیے ماسکو کا دورہ کیا، اور وہ ابھی وہیں موجود تھے کہ روس نے یوکرین پر حملہ کر دیا تھا۔ بعد ازاں سوڈان میں جنگ چھڑنے کے بعد انہوں نے آر ایس ایف کو ویگنر کی جانب سے کسی قسم کی مدد ملنے کی تردید کی۔

### البشیر کی چال الٹی پڑ گئی

اگرچہ آر ایس ایف (ریپڈ سپورٹ فورسز) کی مرکزی لڑاکا اکائیاں بتدریج منظّم اور پیشہ ور بنتی گئیں، لیکن اس کے

اندر پرانے طرز کی نسلی ملیشیاؤں کا ایک اتحاد بھی شامل رہا۔

جب حکومت کو عوامی احتجاجات میں شدت کا سامنا ہوا تو بشیر نے حمیدتی کی افواج کو دارالحکومت خرطوم بھیجنے کا حکم دیا۔

بشیر نے اس کے نام پر ایک لفظی چال چلتے ہوئے اسے 'حمایتی' یعنی 'میرا محافظ' کہا، کیونکہ وہ آر ایس ایف کو باضابطہ فوج اور قومی سلامتی کے اداروں میں ممکنہ بغاوت کے خلاف توازن کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ ان کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اپریل ۲۰۱۹ء میں جمہوریت کے مطالبے کے لیے ہزاروں شہری مظاہرین نے فوجی ہیڈکوارٹر کا گھیراؤ کر لیا۔

بشیر نے فوج کو ان پر گولی چلانے کا حکم دیا، مگر اعلیٰ جرنیلوں، جن میں حمیدتی بھی شامل تھے، نے مشاورت کے بعد فیصلہ کیا کہ بشیر ہی کو معزول کر دیا جائے۔ جمہوریت کے حامی عوام نے اس فیصلے کا جشن فتح کے طور پر منایا۔ کچھ عرصے کے لیے حمیدتی کو سوڈان کے روشن مستقبل کی علامت کے طور پر سراہا گیا۔ وہ نوجوان، خوش گفتار، ملنسار اور ملک کی پرانی اشرافیہ کے خلاف ایک نئے چہرے کے طور پر خود کو پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر یہ تاثر زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔

جب وہ اور فوجی کونسل کے شریک سربراہ، برہان اقتدار کو سویلین حکومت کے حوالے کرنے میں ٹال مٹول سے کام لینے لگے تو مظاہرین کے احتجاج میں شدت پیدا ہونے لگی۔ اس پر حمیدتی نے آر ایس ایف کو چھوڑ دیا۔ ہیومن رائٹس واچ (ایچ آر ڈبلیو) کی ایک رپورٹ میں بیان کیا گیا کہ آر ایس ایف نے سیکڑوں افراد کو قتل کیا، عورتوں کی عصمت دری کی، اور مردوں کو اینٹیں باندھ کر دریائے نیل میں پھینک دیا۔

تاہم حمیدتی نے ان مظالم سے انکار کیا ہے۔

جب سوڈان میں امن و جمہوریت کے فروغ کے لیے قائم چار ملکی اتحاد (امریکا، برطانیہ، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات) نے دباؤ ڈالا تو فوجی اور سویلین رہنماؤں نے افریقی ثالثوں کے تیار کردہ ایک سمجھوتے پر اتفاق کر لیا۔ دو برس تک ایک غیر مستحکم انتظام چلتا رہا، جس میں ایک فوجی غلبے والا خود مختار کونسل اور ایک سویلین کابینہ بظاہر ساتھ کام کرتے رہے۔

## برہان اور حمیدتی ایک دوسرے کے خلاف

جب کابینہ کی جانب سے مقررہ ایک کمیٹی، جو فوج، سلامتی اداروں اور آر ایس ایف کی ملکیتی کمپنیوں کی تحقیقات کر رہی تھی، اپنی رپورٹ کے آخری مراحل میں پہنچی تو برہان اور حمیدتی نے سویلین حکومت کو برطرف کر کے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا کیونکہ اس رپورٹ میں حمیدتی کے تیزی سے اپنی کاروباری سلطنت پھیلانے کی بات سامنے آنے والی تھی۔

مگر اقتدار پر قبضہ کرنے والے یہ دونوں جلد ہی ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے۔ برہان نے مطالبہ کیا کہ آر ایس ایف کو باضابطہ طور پر فوج کے ماتحت کر دیا جائے۔

حمیدتی نے انکار کر دیا۔ اپریل ۲۰۲۳ء میں اس تنازع کے حل کی مقررہ تاریخ سے چند روز قبل آر ایس ایف کے دستے فوجی ہیڈکوارٹر، اہم فوجی اڈوں اور خرطوم کے قومی محل کو گھیرنے کے لیے حرکت میں آئے۔ یہ بغاوت ناکام رہی۔ اس کے نتیجے میں خرطوم ایک میدانِ جنگ بن گیا، جہاں متحارب فریق گلی اور کوچے میں لڑتے رہے۔ دارفور میں بھی شدید تشدد پھوٹ پڑا، جہاں آر ایس ایف کے دستوں نے مسالیت قوم کے خلاف ایک خونی مہم چھیڑ دی۔

اقوامِ متحدہ کے اندازوں کے مطابق اس خونریزی میں تقریباً ۱۵ ہزار عام شہری ہلاک ہوئے، جب کہ امریکا نے اسے نسل کشی قرار دیا۔ آر ایس ایف نے اس الزام کو مسترد کر دیا ہے۔

آر ایس ایف کے کمانڈروں نے اپنے جنگجوؤں کی جانب سے تشدد، اذیت اور قتل کے مناظر کی ویڈیوز خود پھیلائیں، جو ان کے بے خوف ہونے اور سزا سے استثنا کے احساس کی علامت تھیں۔ آر ایس ایف اور اس کی حامی ملیشیاؤں نے سوڈان بھر میں تباہی مچا دی۔ انہوں نے شہروں، بازاروں، اسکول کالجوں اور اسپتالوں کو لوٹا۔

لوٹے گئے سامان کے انبار اب ان بازاروں میں فروخت ہو رہے ہیں جو عوام میں 'دگالو مارکیٹ' کے نام سے جانے جاتے ہیں، اور ان کا دائرہ سوڈان سے نکل کر چاڈ اور دیگر ہمسایہ ممالک تک پہنچ چکا ہے۔ آر ایس ایف نے اس میں اپنے جنگجوؤں کے ملوث ہونے کی تردید کی ہے۔

## کوئی ندامت نہیں

جنگ کے ابتدائی ہفتوں میں قومی محل میں توپ خانے اور فضائی حملوں کے گھیراؤ میں حمیدتی بری طرح زخمی ہوئے اور منظرِ عام سے غائب ہو گئے۔

جب وہ کئی ماہ بعد دوبارہ نمودار ہوئے تو انہوں نے مظالم پر کوئی ندامت ظاہر نہ کی اور نہ ہی جنگ جیتنے کے عزم میں کوئی کمی دکھائی۔

آر ایس ایف نے جدید ہتھیار حاصل کر لیے ہیں، جن میں جدید ڈرون بھی شامل ہیں۔ ان کے ذریعے برہان کے زیرِ قبضہ عارضی دارالحکومت پورٹ سوڈان پر حملے کیے اور الفاشر پر قبضے میں بھی ان کا کلیدی کردار رہا۔

امریکی اخبار نیویارک ٹائمز سمیت متعدد ذرائع کی تحقیقی رپورٹوں کے مطابق یہ ہتھیار متحدہ عرب امارات کے زیرِ انتظام چاڈ کی سرحد کے اندر بنائے گئے ایک فضائی اڈے اور سپلائی بیس کے ذریعے منتقل کیے جا رہے ہیں۔ یو اے ای نے آر ایس ایف کو اسلحہ فراہم کرنے کی تردید کی ہے۔

ان ہتھیاروں کے ساتھ آر ایس ایف اب اپنے سابق اتحادی سوڈانی فوج کے ساتھ ایک اسٹریٹیجک تعطل کی کیفیت میں ہے۔ حمیدتی اب ایک سیاسی اتحاد تشکیل دینے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں بعض سویلین گروہ اور مسلح تحریکیں شامل ہیں، جن میں سب سے نمایاں نوبا پہاڑوں کے وہ سابق دشمن ہیں جن سے وہ پہلے لڑ چکے ہیں۔

انہوں نے 'حکومتِ امن و اتحاد' کے نام سے ایک متوازی حکومت قائم کی ہے، جس کی سربراہی وہ خود کر رہے ہیں۔

الفاشر پر قبضے کے بعد آر ایس ایف اب دریائے نیل کے مغرب میں تقریباً تمام آباد علاقوں پر قابض ہے۔

جب بڑے پیمانے پر قتلِ عام کی رپورٹس سامنے آئیں اور بین الاقوامی سطح پر مذمت بڑھ گئی تو حمیدتی نے الفاشر کے قبضے کے دوران اپنے سپاہیوں کی مبینہ 'خلاف ورزیوں' کی تحقیقات کا اعلان کیا۔ سوڈانی عوام میں قیاس آرائیاں ہیں کہ حمیدتی خود کو یا تو ایک علیحدہ ریاست کا صدر بننے کے لیے تیار کر رہے ہیں یا پھر پورے سوڈان پر حکمرانی کے خواب اب بھی دل میں رکھتے ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے طاقتور سیاسی سرپرست کے طور پر دیکھتے ہوں جو ایک کاروباری گروہ، کرائے کی فوج اور سیاسی جماعت تینوں پر اختیار رکھتا ہو۔ اس صورت میں، اگرچہ وہ سوڈان کے 'چہرے' کے طور پر قابلِ قبول نہ ہوں تب بھی اقتدار کی ڈوریں ان کے ہاتھ میں رہیں گی۔

ان کی فورسز خونریزی کر رہی ہیں اور انہیں اس بات کا یقین ہے کہ اس دنیا میں انہیں کوئی سزا نہیں ملے گی۔

(بحوالہ: ''بی بی سی اردو ڈاٹ کام''۔ ۴ نومبر ۲۰۲۵ء)


حج و عمرہ کی سعادت حاصل کرنے والوں کے لیے راہنما کتاب

ندائے ابراہیمؑ

تالیف و ترتیب: حبیب الرحمٰن (جدہ)

قیمت: ۱۵۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36368020

# کیا کمپیوٹر ہمیں غُلام بنالیں گے؟

''اب مزاحمت سے کچھ حاصل نہ ہوگا، جو ہونا ہے وہ ہونا ہے۔'' یہ جملہ مشہور ٹی وی سیریز اسٹار ٹریک کا ہے اور پس منظر ہے مشینی انسانوں کے ہاتھوں اس دنیا کے غلام بن جانے کا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اگر یوں ہی جاری رہی تو وہ وقت دور نہیں جب اعلیٰ ٹیکنالوجی کی حامل مخلوق ہمیں غلام بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اسٹار ٹریک میں ایک ایسی دنیا کا تصور پیش کیا گیا تھا جس میں انسانوں کو کمپیوٹرز نے غلام بنالیا ہوگا۔ جن لوگوں نے اسٹار ٹریک دیکھی تھی انھوں نے سکون کا سانس لیا تھا کہ یہ سب سائنس فکشن ہے، حقیقت نہیں!

مگر کیا واقعی یہ صرف سائنس فکشن ہے؟ اور اِس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف سائنس فکشن نہیں بلکہ درحقیقت بھی ایسا ہوسکتا ہے۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی جو کچھ کرسکتی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہم روزمرہ زندگی کے کتنے ہی اُمور میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے وسیع تر استعمال سے بخوبی واقف ہیں۔ بیشتر امور میں ہم اس ٹیکنالوجی کے غلام ہو ہی چکے ہیں۔ مالیاتی لین دین کا نظام اب مکمل طور پر کمپیوٹرائزڈ ہے۔ کسی بھی مرحلے پر کوئی بہت بڑی خرابی سب کچھ خاک میں ملاسکتی ہے!

اسٹار ٹریک میں جو لوگ انسانوں کو غلام بنا چکے ہیں وہ بڑے بڑے جہازوں میں سفر کرتے ہیں۔ دیکھنے میں وہ انسان ہیں مگر انسان نہیں۔ یہ سائبورگ ہیں۔ یہ انسانوں سے بالکل مشابہ ہیں مگر انھیں کسی بھی معاملے میں کوئی اختیار حاصل نہیں۔ یہ جو کچھ بھی کرتے ہیں مشینی انداز سے کرتے ہیں۔ ان کے پاس ذہن نہیں۔ یہ سب مرکزی کمپیوٹر ''دی بورگ'' سے جُڑے ہوئے ہیں۔ نیٹ ورکنگ کے اصول کے تحت کام کرنے کی صورت میں ان کی پلگنگ ہوتی ہے یعنی پلگ کے ذریعے ان کا رابطہ ''دی بورگ'' سے قائم رہتا ہے۔ اِنھیں ہم کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے غلام کہہ سکتے ہیں۔ ہم یہ سوچ کر مطمئن ہو رہتے ہیں کہ یہ تو سائنس فکشن ہے مگر کبھی آپ نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی ہے کہ آپ کے حصے کا دی بورگ بھی وارد ہو چکا ہے اور کسی بھی لمحے آپ کو قابو میں کرلے گا۔ کیا آپ انٹرنیٹ سے آشنا نہیں؟ بہت جلد انٹرنیٹ آپ کو مکمل طور پر اپنے تصرف میں کرلے گا اور تب آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپ کے لیے اب مزاحمت کوئی مفہوم نہیں رکھتی۔ یہ حقیقت بھی اب ہمیں تسلیم کر ہی لینی چاہیے کہ انٹرنیٹ نے ہمیں عملاً غلام بنا ہی لیا ہے۔ ہم بات بات پر، قدم قدم پر انٹرنیٹ، اسمارٹ فونز اور ایپس کے محتاج ہیں۔ اِس حوالے سے کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی پر ہمارا مدار بڑھتا ہی جارہا ہے۔

اب ذرا ایک چھوٹا سا تجربہ کرکے دیکھ لیں۔ اپنا پی سی کھولیں، انٹرنیٹ پر جائیں اور گوگل، یاہو یا کسی بھی دوسرے بڑے سرچ انجن پر کوئی لفظ ٹائپ کرکے دیکھیں کہ وہ کیا نتائج دے رہا ہے۔ اب کسی دوسرے سرچ انجن پر وہی لفظ ٹائپ کرکے دیکھیں کہ اس کے نتائج بھی وہی ہیں جو کسی اور سرچ انجن کے ہیں یا ہوسکتے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے آپ خود کو انٹرنیٹ کے مختلف سرچ انجنز پر بندھا ہوا سا محسوس کریں گے۔ اگر آپ اس بات کو محض بکواس سمجھ کر نظر انداز کرنے کے موڈ میں ہیں تو ذرا ٹھہریے، جو کچھ اب آپ پڑھنے والے ہیں اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ آپ کو کہاں لے جارہے ہیں!

آپ کو سائبورگ یعنی مشینی غلام بنانے کی تیاریاں تو ایک طویل عرصے سے جاری ہیں۔ کسی کی سماعت یا بینائی کو مشینوں کے ذریعے بحال ہوتے نہیں دیکھا آپ نے؟ یقیناً دیکھا ہے۔ تو پھر حیران ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ جسم میں چند ایک مشینوں یا چپس کے نصب کیے جانے کی صورت میں جسمانی خامیوں پر قابو پانے میں مدد ملتی ہے۔ انسان کی معذوری دور کرنے کے حوالے سے بہت سے تجربات انتہائی حیرت انگیز طور پر کامیاب رہے ہیں اور معاملات تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اگر کسی کا ایک ہاتھ نہیں ہے تو مشینی ہاتھ لگا کر اسے معمول کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنانے کے بارے میں سوچا جارہا ہے۔ یہ انقلابی تبدیلی چند برسوں میں اتنی عام ہو جائے گی کہ کوئی اِس کے بارے میں سوچ کر حیران ہونا گوارا نہ کرے گا۔ ایسے ماؤز اور گرسر بھی بنائے جارہے ہیں جو محض آنکھ کے نہیں بلکہ ذہن کے اشارے پر کام کیا کریں گے۔

ماہرین کہتے ہیں یہ تو ابتدا ہے۔ ابھی بہت کچھ واقع ہونا ہے۔ وہ زمانہ بھی آنے والا ہے کہ اگر آپ کوئی غیر ملکی یا مکمل طور پر اجنبی زبان سیکھنا چاہیں تو کوئی مشکل محسوس نہیں کریں گے۔ ڈاکٹر کے پاس جائیے اور اُس سے کہیے کہ وہ آپ کے دماغ میں ایسی چپ لگادے جس کی مدد سے کوئی خاص زبان سیکھنا آپ کے لیے ممکن ہو جائے۔ ڈاکٹر یہ کام کردے گا اور آپ کسی بھی مخصوص زبان کو سیکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اگر بینائی میں کمزوری محسوس کر رہے ہیں تو گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر کے پاس جائیے، وہ آپ کی پتلی میں پیدا ہونے والی وسعت کو ختم کرکے آپ کی بینائی کو اِس حد تک درست کردے گا کہ عینک یا کونٹیکٹ لینس لگانے کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوگی۔ آپ سوچیں گے یہ تو آئیڈیل صورتِ حال ہے۔ اگر کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی مدد سے زندگی میں سہولت پیدا ہو تو اِسے اپنانے میں حرج ہی کیا ہے؟ مگر سب کچھ ٹھیک نہیں۔ آپ کے جسم میں صرف کمپیوٹر ٹیکنالوجی داخل نہیں ہوگی، بلکہ انٹرنیٹ کو بھی آپ کے جسم میں داخل ہونے کا موقع مل جائے گا۔ ہائی ٹیک ممالک میں ایک عام آدمی کی زندگی میں انٹرنیٹ غیر معمولی حد تک داخل ہو چکا ہے۔ ہالینڈ اور سنگاپور میں حالت یہ ہے کہ آپ کہیں بھی جائیے، گیمز سے دل بہلائیے، شاپنگ کیجیے، گانے سنیے یا کوئی اور کام کیجیے..... ہر مرحلے پر انٹرنیٹ آپ کی زندگی کا لازمی جُز ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر کچھ پڑھنا ہے تو انٹرنیٹ پر پڑھیے، کچھ جاننا ہے تو انٹرنیٹ کی مدد سے جانیے۔ یوٹیلٹی بل ادا کرنا ہے تو انٹرنیٹ کی خدمات حاضر ہیں۔ دوست سے بات کرنی ہے تو انٹرنیٹ کا سہارا لیجیے۔ ای میل کرنی ہے تو ظاہر ہے کہ انٹرنیٹ کے بغیر ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ کی زندگی کس حد تک کمپیوٹر ٹیکنالوجی پر منحصر ہے! ایسے میں اگر کل یہ ٹیکنالوجی آپ کو اپنا غلام بنالے تو کسی کو حیرت کیوں ہو؟

اور اب انٹرنیٹ کا دائرہ مزید وسیع ہو رہا ہے۔ یہ ہمارے ڈیسک ٹاپ پر تو تھا ہی، بعد میں لیپ ٹاپس اور موبائل فونز میں بھی داخل ہوا۔ ٹی وی سیٹ کو بھی انٹرنیٹ سے منسلک کیا جاچکا ہے۔ انٹرنیٹ بہت تیزی سے ہماری کاروں اور گھریلو برقی آلات میں بھی داخل ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انٹرنیٹ کو اب ہر اُس آلے سے منسلک کیا جاچکا ہے جس کا تعلق رابطہ قائم کرنے سے ہے۔

ہمارے دماغ میں نصب کیے جانے والے کمپیوٹرز بھی انٹرنیٹ سے منسلک ہوں گے۔ فوائد اس قدر زیادہ ہیں کہ ہم اس تبدیلی کی راہ روکنے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ ہمارا دماغ مسلسل آن لائن رہا کرے گا! آپ کے کان ہر وقت آن لائن رہیں گے، آپ کی آنکھوں کا انٹرنیٹ سے رابطہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔ یہ سب کیا ہے؟ ذہن سے ذہن کے رابطے کی ایک شکل؟

اور کیا! آپ نے اپنے دماغ میں لگی ہوئی چپ کی مدد سے اپنی خالہ کے بارے میں سوچا جو کسی دوسرے ملک میں رہتی ہیں اور اگلے ہی لمحے آپ کی خالہ کی جانب سے سگنل موصول ہوگیا! وہ بھی تو آپ کے بارے میں سوچ رہی ہوں گی!

اصل مسئلہ یہ ہے کہ آن لائن رہنے کی صورت میں آپ کا ذہن آپ کا نہیں رہے گا۔ آپ کا ذہن آپ کے لیے مستقل پاور ہاؤس کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی آپ کا عصبی اور فکری مرکز ہے، یہی آپ کا ہر اعتبار سے کنٹرول سینٹر ہے۔ اگر اسی پر آپ کا اختیار نہ رہا تو؟ ظاہر ہے کہ آپ کا اپنے وجود پر سے بھی اختیار ختم ہوسکتا ہے! اِس وقت ایسے سوفٹ ویئرز پر کام ہورہا ہے جو اپنا معیار بلند تر کرتے رہتے ہیں۔ کئی سوفٹ ویئر ایسے ہیں جو اپنی اپ گریڈیشن میں کسی کی مدد کے محتاج نہیں ہوتے۔ یہ تو بہت بڑی خوبی ہے مگر بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ سوفٹ ویئرز میں وائرس بھی تو آجاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ذہن کا متاثر ہونا فطری امر ہے۔ اگر کبھی ایسا ہوا کہ آپ کے ذہن میں لگی ہوئی کمپیوٹرائزڈ اور آن لائن چپس میں وائرس کے پنپنے کی رفتار بڑھتی ہی رہی تو کیا ہوگا؟ ایسی صورت میں آپ کے ذہن کے ناکارہ ہوجانے کا خطرہ بھی برقرار رہے گا! یعنی یہ ہوسکتا ہے کہ آپ ٹھیک ٹھاک کام کر رہے ہیں اور اچانک کہیں کوئی گڑبڑ ہوئی اور آپ گئے کام سے! ایسی کسی بھی خرابی کی ابتدا میں تو یہ ہوگا کہ آپ کا سَر چکرانے لگے گا، آپ کو بہت سے امور میں بے بنیادی تصورات گھیر لیں گے۔ اس کے بعد جب خرابی زیادہ پیچیدہ ہوگی تو معاملات بہت بگڑ جائیں گے۔ ایسی صورت میں آپ کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور یادداشت بھی شدید متاثر ہوگی۔ کہیں اندر سے کوئی آواز آئے گی کہ اب مزاحمت لاحاصل ہے۔ اور پھر آپ مکمل طور پر پاگل بھی ہوسکتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو آپ اپنے ہی جسم کے غلام ہوکر رہ جائیں گے!

جب آپ کسی بڑے کمپیوٹر (دی بورگ) سے منسلک ہوں گے تو ظاہر ہے کہ اُسی کی مرضی کے تابع رہتے ہوئے کام بھی کرنا پڑے گا۔ ہوسکتا ہے کہ آپ بیشتر معاملات میں آزاد نہ رہ پائیں۔ اور آپ کو آن لائن ہدایات کے تحت زندگی بسر کرنی پڑے۔ ہوسکتا ہے کہ مرکزی کمپیوٹر آپ کو حکم دے کہ فلاں شخص کے دماغ میں کوئی چپ نصب کردو۔ نہ آپ مزاحمت کر پائیں نہ وہ مزاحمت کر پائے اور یوں آپ دونوں ہی ایک کمپیوٹر کے غلام ہوکر رہ جائیں!

////// باقی صفحہ نمبر ۴ \\\\\\

# غزہ امن مُعاہدہ: امکانات اور خدشات

تلخیص و ترجمانی: محمد طیب حنیف میمن

اسرائیل اور فلسطین کے درمیان ہونے والے (زبانی) جنگ بندی معاہدے نے عالمِ اسلام بالخصوص فلسطینی عوام میں خوشی کی ایک لہر دوڑا دی ہے۔ اس زبانی معاہدے کی باقاعدہ دستاویزی کارروائی ۱۳/اکتوبر ۲۰۲۵ء کو ہوئی۔

اسی تناظر میں 'اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی' کے زیرِ اہتمام ''غزہ امن معاہدہ: امکانات اور خدشات'' کے عنوان سے ایک آن لائن سیشن ۱۳/اکتوبر کو شام ۷ بجے منعقد ہوا، جس میں ڈاکٹر خالد قدومی (ترجمان حماس) نے بطور مہمانِ خصوصی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ چونکہ سیشن میں آن لائن بڑی تعداد میں شرکا موجود تھے، اس لیے سوال و جواب کا سلسلہ طویل رہا۔ زبان کی نامانوسیت اور سوالات کی طوالت کے پیشِ نظر ڈاکٹر صاحب کی گفتگو کی ترجمانی کرتے ہوئے، سوالات کو ان کے موضوعاتی عنوانات کے ساتھ مرتب کر کے قارئین کے لیے پیش کیا جارہا ہے۔ اس حوالے سے حتی المقدور کوشش کی گئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے کلمات ہی کو زبان کی سلاست برقرار رکھتے ہوئے پیش کیا جائے۔ (مرتب)

## معاہدے کی کامیابی اور عالمِ اسلام کی خاموشی

الحمدللہ! آج ہمیں غزہ اور اسرائیل کے درمیان جنگ بندی کا معاہدہ دیکھنا نصیب ہوا۔ مجاہدین کی جانب سے تحریکِ مزاحمت کے سلسلہ میں قربانیاں رنگ لائیں اور دونوں جانب قیدیوں کی رہائیاں شروع ہوئیں۔ آج ۲ ہزار فلسطینی قیدی رہا ہوئے، جو دس اسرائیلی قیدیوں کے بدلے تھے۔

مگر گزشتہ دنوں بگڑتی صورتِ حال پر عالمِ اسلام کے سربراہان کی خاموشی کا نقصان ہم سب کے سامنے ہے، یہی خاموشی اسرائیل کو سرکشی پر آمادہ کرنے کی بنیادی وجہ بنی۔ آج بھی ظلم و بربریت سہنے اور فاقہ کشی کی زندگی گزارنے پر مجبور فلسطین و غزہ کے عوام کو دہشت گرد بتلایا جارہا ہے، مگر اصل دہشت گردی کا سب سے بڑا چہرہ ''اسرائیلی سربراہ نیتن یاہو'' اور ''امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ'' ہے، مگر انہیں امن پسند اور صلح جو پیش کیا جارہا ہے۔ الی اللہ المشتکی۔

## حماس اور فلسطین کا دوٹوک مؤقف

مختلف ممالک سے چلنے والے فلوٹیلا نے ثابت کیا کہ غیر مسلم قومیں بھی ہمارے لیے دل میں درد رکھتی ہیں، ہمارے دکھ درد میں سہارا بننا پسند کرتی ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ غزہ میں موجود مجاہدین کی محنت و کوشش اس سب کے مقابلے میں کچھ نہیں، ان کی قربانیاں خدا کے یہاں مقبول ہیں۔ ہمیں اس سے سبق ملتا ہے کہ ہم ان کی قربانیوں کے راستے کو اپنائیں، اور ان کے مقصد کو پورا کرنے میں معاون بنیں۔

جہاں تک اسرائیل اور فلسطین کے درمیان معاہدہ کا تعلق ہے، تو اس میں ہم نے اپنی چار واضح ریڈ لائنز رکھی ہیں:

۱۔ جنگ بندی

۲۔ سرحدوں کا فوری کھولا جانا

۳۔ امدادی اور غذائی کنٹینرز کا بلاتعطل داخلہ

۴۔ اسرائیلی افواج کا ہماری مقدس سرزمین سے انخلا

حماس کے سربراہان کا اس معاہدہ کے لیے مذاکرات کرنا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ ہم امن پسند اور سیاسی حل چاہتے ہیں۔ بقول ہمارے بزرگ ساتھی اسماعیل ہنیہ شہید کے یہ معاہدہ سازی کے لیے مذاکرات کی جدوجہد آزادی کی طرف ایک سنگ میل ہے۔ لیکن اگر ہماری ریڈ لائنز پار کی گئیں تو مزاحمت پھر شروع ہو جائے گی اور اس کا اثر ایک بار پھر پورے عالم میں محسوس کیا جائے گا۔

## معاہدہ کی شق: حماس کا اسلحہ اسرائیل کے سپرد کرنا

واضح رہے کہ ہم جنگ بندی کے دوران اور بعد میں اپنے اسلحے کو برقرار رکھیں گے۔ یہ اسلحہ تحریکِ مزاحمت کا ستون ہے۔ یہ جدوجہدِ آزادی کی جنگ ہے۔ فریقِ مخالف اپنی زور آزمائی سے اپنے قیدیوں کو رہا نہ کرا سکا، مگر اب اسی اسلحے کی بدولت وہ آج معاہدہ پر مجبور ہوا ہے۔ یہ ہتھیار تو ہمارا دفاعی و سیاسی وسیلہ ہیں۔ ہر قوم اپنے ملک کی حفاظت کے لیے اسلحہ رکھنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ ہم کسی صورت انہیں فریقِ مخالف کے حوالے نہیں کریں گے۔ قرآن مجید میں واضح طور پر اس (یہود) قوم کی صفت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ بد عہد قوم ہے، اور اس پر ان کا ماضی بھی گواہ ہے۔ آج ساری دنیا نے دیکھا کہ مجاہدین نے قیدیوں کے تبادلے کے وقت بھی ہتھیار ہاتھ میں رکھے تھے۔

## ''شرم الشیخ'' مصر میں معاہدہ کی تقریب

آج ''شرم الشیخ'' میں جس معاہدے کی بات ہورہی ہے،

وہ خود تذبذب کا شکار ہے۔ ذرائع کے مطابق اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو شرکت نہیں کر رہا، ابتدا میں فلسطینی صدر محمود عباس کو بھی نہیں بلایا گیا، بعد میں دباؤ پر انہیں دعوت دی گئی۔ مگر حماس اور فلسطینی مزاحمتی تنظیموں کو تو سرے سے شامل ہی نہیں کیا گیا۔ یہ امن پسند معاہدہ کیسا ہے کہ جس میں دونوں فریق ہی شامل نہیں؟

## فلسطینی رہنماؤں کی قید سے رہائی

اس معاہدے میں ہماری طرف سے یہ مطالبہ رکھا گیا تھا کہ فلسطینی رہنماؤں کو رہا کیا جائے گا، مگر افسوس! اسرائیل کی جانب سے اس شرط کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ ۳,۹۸۵ قیدیوں کی فہرست بنا کر انہیں دی گئی، جن میں سے پانچ سو قیادت کے درجے کے افراد ہیں، مگر ان کے سوا آج دو ہزار قیدی رہا کیے گئے۔ ہمارے ایک رہنما کی اہلیہ کا آج ایک واضح بیان سامنے آیا جس میں وہ اپنے پوتوں کو خوشخبری دے رہی تھیں کہ ''آج تمہارے دادا رہا ہو کر آنے والے تھے، مگر اسرائیل نے ہماری شرط کو قبول نہیں کیا''۔ پھر اسی باہمت خاتون نے کہا کہ ''ہمیں تحریک حماس کی قیادت پر مکمل اعتماد ہے، کیونکہ غزہ کا امن ہمارا سب سے بڑا مقصد تھا، اور وہ مقصد الحمدللہ حاصل ہو چکا ہے''۔ بہرصورت یہ نہ پہلی ڈیل ہے اور نہ آخری۔ اسرائیلی سربراہ نیتن یاہو نے معاہدہ ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر ہم نے تصادم نہیں، مذاکرات کو ترجیح دی، کیونکہ ہم ایک امن پسند قوم ہیں، اور ایک مستقل ریاست تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔

## مستقبل میں غزہ کی قیادت

مصر کی طرف سے تجویز پیش کی گئی ہے کہ غزہ میں ایک ٹیکنو کریٹ کمیٹی قائم کی جائے، جس میں کوئی سیاسی شخصیت شامل نہ ہو اور فلسطینی ہی ۴۰ افراد منتخب کیے جائیں، جو لوگ عملی اور تکنیکی معاملات میں قیادت کریں گے۔

جبکہ دوسری جانب ڈونلڈ ٹرمپ نے (اسرائیل اور عرب ممالک کے درمیان دوستانہ تعلقات کی بحالی کے خوش کن نام کو استعمال کر کے اسرائیل کی ناجائز ریاست کو تسلیم کرنے کے لیے) ۲۰ نکات پر مشتمل ایک پلان تیار کیا ہے، مگر ہمارا مؤقف یہی ہے کہ اس طرح کے منصوبے صرف تب مؤثر ہو سکتے ہیں جب تمام سیاسی پارٹیوں کو ساتھ بٹھا کر طے کیا جائے۔

فی الحال الحمدللہ، غزہ میں قیادت کے حوالے سے پریشانی کی کوئی بات نہیں، کیونکہ فلسطینی عوام اور ہم موجودہ قیادت ''حماس'' پر مکمل اعتماد رکھتے ہیں۔ اسی اعتماد کے پیش نظر میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ ''حماس'' صرف ایک تنظیم نہیں رہی بلکہ ایک آئیڈیا ہے جو آج تمام دنیا میں اثر رکھتا ہے۔ فلوٹیلا کے واقعات سے یہ ثابت ہوا کہ ''حماس'' نے نہ صرف غزہ میں امن قائم رکھنے کے لیے کوششیں کیں، بلکہ عالمی سطح پر بھی اپنی طاقت دکھائی۔

## حماس اور القسام میں فرق

''حماس'' دراصل ایک سیاسی و سماجی تحریک کا نام ہے، جبکہ ''القسام'' حماس کا عسکری و دفاعی بازو (Military and Defence Wing) ہے، جو میدانِ عمل میں حصہ بننے والی حماس کی ایک شاخ ہے۔

''حماس'' یہ ''الحرکۃ المقاومۃ الاسلامیۃ'' کا مخفف ہے۔

''القسام'' اس کا عسکری وِنگ ہے۔

''القسام'' کی وجہ تسمیہ بھی قابلِ فخر ہے کہ یہ ''شیخ عزالدین القسام'' کی جانب منسوب ہے، جو شام کے علماء ربانیین میں سے تھے۔ انہوں نے قرآن و حدیث کو سمجھنے کے بعد انگریز کے دور میں فلسطین جانے کا عزم کیا، اور یہاں منبر و محراب کو زینت بخشی۔ مگر جب حالات کی نزاکت کو دیکھا تو میدانِ عمل میں خود کو پیش کیا۔ چنانچہ انگریز سے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائے اور مزاحمت اختیار کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ انہی کی یاد میں یہ نام اختیار کیا گیا۔

آج بھی میں اسلامی ممالک میں موجود علماء اہل حق و ربانیین کی خدمت میں دست بستہ عرض کروں گا کہ اپنی ذمہ داری کو سمجھیں، ''اقصیٰ'' کے لیے آواز بلند کریں۔ عوام میں اس سرزمین کی اہمیت کو اجاگر کریں۔ کیونکہ میرے نزدیک ہم علماء کرام کی بدولت انقلاب لا سکتے ہیں۔ ہم اپنی نسلوں میں اس فریضہ سے متعلق احساس و شعور زندہ و بیدار رکھ سکتے ہیں۔

## ابوعبیدہ سے متعلق تفصیل اور یحییٰ السنوار کی میت وصولی سے متعلق اقدامات

ابوعبیدہ سے متعلق اب تک قسام کی جانب سے باضابطہ طور پر کوئی پیغام جاری نہیں ہوا ہے، لہٰذا اس معاملے میں سکوت اختیار کرنا ہی بہتر ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ ضرور نشر کی جاتی۔

ہمیں توجہ اس بات پر دینی ہے کہ ہمارے محبوب دوست یحییٰ السنوار شہیدؒ اب ہمارے درمیان نہیں ہیں، مگر ان کی کتابیں اور ان کا مشن آج بھی زندہ ہے۔ ان کی مشہور کتاب ''الشوک والقرنفل'' کے کئی تراجم شائع ہو چکے ہیں اور وہ آج بھی ایک فکری ورثہ کے طور پر موجود ہے۔ اب تو روسی زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ لہٰذا ہمیں ان شخصیات کے مشن پر خود کو لانا ہے۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ اب اسلامی دنیا میں مسلمان اپنے بچوں کے نام ''یحییٰ السنوار''، ''اسماعیل ہنیہ'' اور ''ابوعبیدہ'' کے نام سے موسوم کرنے پر فخر کرتے ہیں۔ یہ سب ان حضرات کی قربانیوں کا نتیجہ ہے۔

باقی یحییٰ السنوار کے جسدِ خاکی کا معاملہ ہے تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی فرد کی نعش کا معاملہ ہمارے لیے اہم بحث نہیں، اصل بات ان کا نظریہ، ان کا عزم اور ان کا مشن ہے، جس کو زندہ رکھنا ہماری ذمہ داری ہے۔ ان کے اصول و مقاصد ہمارے دلوں میں برقرار رہیں اور آئندہ نسلیں اسی جذبے کو سمجھیں، اس کی ہمیں ہر دم کوشش کرنی ہے۔

## معاہدے کا مقصد اسرائیل کو تسلیم کرنا ہرگز نہیں!

یہ معاہدہ اس بات کی نشانی ہرگز نہیں ہے کہ ہم نے اسرائیل کو بطور ریاست تسلیم کر لیا ہے اور اس کے آگے سرینڈر ہو گئے ہیں، ہرگز نہیں! یہ ایک وقتی حکمت عملی ہے، جسے ہم نے اپنے مفادات اور ریڈ لائنز کو یقینی بنانے کے لیے اختیار کیا۔ ہماری چار بنیادی ریڈ لائنز میں بالکل واضح بتا چکا ہوں، یہی اس وقت اہل غزہ و فلسطین کا بنیادی مطالبہ و ضرورت ہے۔ اس معاہدہ میں ہم نے ہر بات بلا شرط قبول نہیں کی۔ بلکہ ''ہاں، مگر'' کی حکمت عملی اپنائی ہے۔ البتہ بعض نکات پر مجبوراً رضامندی دکھائی، تاکہ بنیادی مقاصد اور عوامی مفاد حاصل ہو سکیں، مگر اپنی سالمیت اور اپنے بنیادی مؤقف سے ہٹنے کو ہم بالکل تیار نہیں۔

## ناجائز ریاست ''اسرائیل'' سے متعلق پاکستان کا مؤقف

آج کل یہ بات بھی گردش کر رہی ہے کہ پاکستان بھی ''ابراہیم معاہدات'' کی حمایت کر سکتا ہے۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ پاکستان ہرگز تسلیم نہیں کرے گا، ان شاءاللہ، کیوں کہ یہ بات پاکستان کے قائد و بانی محمد علی جناح کے نظریہ اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی روح سے متصادم ہے۔ یہی بات اب تک ہمارے معتبر ذرائع اور سربراہان سے ملاقات کے دوران معلوم ہوئی ہیں۔

تو اس حوالے سے میں عوام سے گزارش کروں گا آپ ہر پلیٹ فارم پر اپنی آواز بلند کریں، کیونکہ یہی دباؤ حکمرانوں کو درست راستے پر لاتا ہے۔ اس کی موجودہ مثال انڈونیشیا کے صدر کا سفر ہے، جو تل ابیب جانا طے پایا تھا، مگر عوامی احتجاج اور دباؤ کے باعث ملتوی کرنا پڑا۔ یہ دکھاتا ہے کہ عوامی طاقت فیصلوں کو بدل سکتی ہے۔ لہٰذا عوام اپنی وسعت و طاقت کے بقدر ہر پلیٹ فارم پر مسجدِ اقصیٰ کی آواز کو اٹھائیں۔

////// باقی صفحہ نمبر ۱۴ \\\\\\

## ظہران ممدانی

# دہلی کے بے گھر بچّوں کے خواب سے نیویارک تک

افتخار گیلانی

جب ظہران ممدانی نے نیویارک کے نئے میئر کے بطور الیکشن میں جیت درج کی، تو مجھے دہلی کی ایک پرانی، پسینے سے بھری دوپہر یاد آئی۔

صحافت کے ابتدائی دن تھے۔ میں نے اُن دنوں ایک فیچر ایجنسی 'فیچر اینڈ نیوز لائینس' یعنی فانا میں کام کرنا شروع کیا تھا کہ ایڈیٹر ایم اے سراج نے دہلی کے انٹر اسٹیٹ بس ٹرمینل کے بغل میں بے گھر بچوں کی طرف سے قائم کردہ ایک ڈھابہ پر فیچر لکھنے کی ہدایت دی۔

ہَوا میں حبس تھا، زمین پر گرد، اور ایک نوجوان رپورٹر کام کے لیے روانہ ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ اس ریستوران کے منتظم، باورچی اور بیرے سبھی بے گھر بچے تھے، جو یا تو اس سے قبل بھیک مانگ کر یا چھوٹے موٹے جرائم کر کے گزارہ کرتے تھے۔

ان سے بات کر کے معلوم ہوا کہ یہ ڈھابہ سلام بالک ٹرسٹ کی دَین ہے، جس کی روحِ رواں معروف فلمساز میرا نائر تھی۔ ۱۹۸۸ء میں ان کی شہرہ آفاق فلم 'سلام بامبے' ریلیز ہوئی تھی، جس کی کہانی بمبئی کی سڑکوں پر زندگی گزارنے والے بے گھر بچوں کے اردگرد گھومتی ہے۔

خاص بات یہ تھی کہ اس میں اداکاروں کے بجائے حقیقی بے گھر بچوں نے کام کیا تھا۔ اس دن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں جس چھوٹے سے ڈھابے پر پہنچا ہوں، وہاں کی کہانی ایک دن نیویارک کے سٹی ہال تک جا پہنچے گی۔

فلم نے ممبئی کے بے گھر بچوں کی دنیا کو جس بے باکی اور سچائی سے دکھایا، اُس نے دنیا بھر کو ہلا کر رکھ دیا۔ فلم کو آسکر کی نامزدگی ملی۔ لیکن میرا نائر کے نزدیک کہانی فلم کے آخری منظر پر ختم نہیں ہوئی تھی۔

وہ چاہتی تھیں کہ اُن بچوں کی زندگی فلم کے پردے سے نکل کر حقیقت کا روپ دھارے۔ اِسی سوچ کے تحت انہوں نے اپنی والدہ ڈاکٹر پروین نائر کے ساتھ ۱۹۸۹ء میں 'سلام بالک ٹرسٹ' قائم کیا۔ ایک ایسی پناہ گاہ جہاں ان بے گھر بچوں کو نہ صرف چھت ملی، بلکہ تعلیم، تربیت، اور وقار بھی۔

میں جب اس ڈھابے کی رپورٹنگ کر رہا تھا، تو فضا میں امید کی خوشبو تھی۔ بچے ہنس رہے تھے، سیکھ رہے تھے اور زندگی کی نئی تعریف لکھ رہے تھے۔ پاس کے فٹ پاتھ پر ایک خاتون نے اسکول کھولا ہوا تھا، جہاں سڑکوں پر پلنے والے چھوٹے بچے سلیٹ ہاتھوں میں لیے حروف تہجی سیکھ رہے تھے۔

منتظمین سے میرا نائر کا نمبر حاصل کر کے میں نے ایک بوتھ سے اُن کو فون کیا، تو انہوں نے خود ہی کال اٹھائی اور مجھے اگلے روز جنوبی دہلی کے وسنت وہار علاقہ میں واقع اُن کی رہائش گاہ آنے کے لیے کہا۔

ان سے ملنے سے ایک روز قبل میں نے دریا گنج میں گولچہ سینما پہنچ کر 'سلام بامبے' فلم دیکھی۔ اتنی بڑی فلم پروڈیوسر ہونے کے باوجود حیرت انگیز طور پر ان کا کوئی سیکرٹری نہ منیجر تھا۔

فون بھی خود اٹھایا، وقت بھی خود طے کیا، اور گھر کا دروازہ بھی خود کھولا۔ وہ مشہور فلمساز کے بجائے ایک عام، سادہ، لیکن بیحد باوقار عورت کے طور پر سامنے آئیں۔ ان کی باتوں سے لگا کہ ان کے لیے سینما محض فن نہیں، ایک ذمہ داری ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں ''اگر ہم نے کہانی دکھادی، تو اس میں ابھارے گئے ایشوز کو بھی ایڈریس کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ بھی ہم ہی کو کرنا ہے۔ اس صورتِ حال کو اب ہمیں ہی بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

یہ الفاظ اُس وقت ایک مشن کا اعلان لگے۔ لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایک دن اسی مشن کا بیج اُن کے بیٹے کی سیاست میں پھل دے گا۔

ایک دہائی کے بعد غالباً ۲۰۰۵ء یا ۲۰۰۶ء میں مجھے ایک فون آیا۔ دوسری طرف معروف افریقی نژاد مفکر اور پروفیسر محمود ممدانی تھے۔ اُن کی کتاب 'گڈ مسلم بیڈ مسلم' اُس وقت عالمی سطح پر بحث کا محور تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہندوستان میں 'مسلم نوجوانوں اور قانون' پر تحقیق کر رہے ہیں اور میری کتاب 'My Days in Prison' کا انہوں نے مطالعہ کیا ہے اور اس سلسلے میں ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔

جب میں ملاقات کی جگہ پہنچا تو وہ وہی وسنت وہار کا بنگلہ تھا، جہاں ایک زمانے میں میری میرا نائر کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔ اس دن معلوم ہوا کہ وہ میرا نائر کے شوہر ہیں۔

میری جیل کی روداد، شناخت، نگرانی، حکومت کا دہشت گردی کے حوالے سے رویہ، ریاستی جبر وغیرہ پر جب بات ہو رہی تھی، تو اس دوران ایک نوعمر لڑکا کمرے میں آتا جاتا رہا۔ مؤدب، خاموش مگر تجسس سے بھرا۔ محمود ممدانی نے مسکراتے ہوئے کہا؛ یہ میرا بیٹا ظہران ہے۔

وہ اُس وقت نیویارک کے ایک اسکول میں زیرِ تعلیم تھا۔ ہماری گفتگو جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی، اُس لڑکے کے چہرے پر غور و فکر کے آثار نمایاں ہوتے گئے۔ میں نے سوچا، یہ محض ایک اسکول کا طالبعلم نہیں، بلکہ ایک ایسے گھر کا فرد ہے جہاں فن اور فکر روزمرّہ کی بات چیت ہے۔

دو دہائیاں گزر گئیں۔ وہی لڑکا، جو ایک دن اپنے والد کی کتابوں کے بیچ بیٹھا ہماری باتیں سن رہا تھا، آج نیویارک سٹی ہال کی سیڑھیوں پر کھڑا ہے۔ اُس کے چہرے پر وقار، لہجے میں یقین اور آنکھوں میں انسانیت کا عکس معلوم ہوتا ہے۔

اس کی کامیابی محض ایک شخص کی جیت نہیں تھی، بلکہ ایک نظریے کا احیا تھی، ایسا نظریہ جو ہمدردی کو سیاست کا مرکز مانتا ہے۔ 'سلام بالک ٹرسٹ' جس پر میں نے برسوں پہلے رپورٹ کی تھی، آج ہندوستان کے کامیاب ترین فلاحی ماڈلز میں سے ایک ہے۔ ایک کمرے سے شروع ہونے والا ادارہ اب دہلی میں ۱۷ مراکز اور دیگر شہروں میں شاخوں کے ساتھ ہزاروں بے گھر بچوں کو زندگی دے رہا ہے۔

اب تک ایک لاکھ سے زائد بچے اس کے ذریعے تعلیم، رہائش، مشاورت اور تربیت پا چکے ہیں۔ وہ ڈھابہ جس پر میں نے رپورٹ کی تھی، اس نے ان بچوں کو ایک نئی زندگی اور بااختیار بنایا۔ انہی میں ایک وِکی رائے بھی ہے، جو گھر سے بھاگ کر آیا تھا۔ 'سلام بالک' نے اُسے فوٹوگرافی سکھائی، تربیت دی، اور ایک دن وہ انہی چند فوٹوگرافروں میں شامل ہوا جنہیں نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تعمیرِ نو کی تصویری دستاویز بنانے کا موقع ملا۔

کیمپالا، یوگنڈا میں ۱۹۹۱ء میں پیدا ہونے والا ظہران ممدانی، افریقا اور امریکا میں پروان چڑھا۔ اُس نے اپنے والد کی فکری گہرائی اور والدہ کی انسان دوستی دونوں جذب کیں۔ سیاست میں آنے سے پہلے وہ نیویارک کے کوئنز علاقے میں ہاؤسنگ کونسلر کے طور پر کام کرتا تھا۔

وہ اُن تارکینِ وطن کے گھروں میں جا کر بیٹھتا جنہیں بے دخلی کا سامنا تھا۔ ان کے لیے قرضے بندوبست کرنے کے لیے، بینکوں سے بات کرتا، اور نظام کی بند دیواروں میں اُن کے لیے دروازہ تلاش کرتا تھا۔ بعد میں ریاستی اسمبلی کا رکن بن کر اُس نے ٹیکسی ڈرائیوروں کے ساتھ بھوک ہڑتال کی، کرایہ داروں کے ساتھ احتجاج کیا، اور ہمیشہ اُن کے شانہ

بشانہ کھڑا ہوا جو نظام کے کنارے پر دھکیل دیے گئے تھے۔

اُس کی سیاست نظریہ نہیں بلکہ تجربہ تھی۔۔۔ وہ سیاست جو دفتر میں نہیں، گلیوں میں لکھی جاتی ہے۔ لوگ اکثر ظہران ممدانی کا موازنہ سابق امریکی صدر براک اوباما سے کرتے ہیں، دونوں افریقی نژاد، دونوں کئی ثقافتوں کے سنگم پر ہیں۔

مگر غور سے دیکھا جائے تو ان کے راستے مختلف ہیں۔ اوباما اُس وقت سیاست میں آئے جب کامیابی کے لیے تسلسل اور توازن ضروری تھا۔ اُنہوں نے اپنے درمیانی نام 'حسین' کو چھپایا، کیونکہ وہ مسلم کے طور پر اپنے آپ کو شناخت نہیں کروانا چاہتے تھے۔ اُن کی سیاست رنگ اور مذہب سے اوپر اٹھنے کی علامت تھی، لیکن اُس میں شناخت کا عنصر کم تھا۔

ظہران ممدانی ایک نئے عہد کا نمائندہ ہے، جو میل جول سے زیادہ سچائی پر اصرار کرتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کو اس کی شناخت کے حوالے سے پہچانیں۔۔۔ ایک مسلمان، افریقی اور جنوبی ایشیائی نژاد۔ ان کا کہنا ہے کہ ''ہمیں اپنی شناخت چھپانی نہیں چاہیے، بلکہ اُسے عزت دینی چاہیے۔''

یہی ان کی سیاست کا بنیادی فرق ہے۔

ظہران کی انتخابی مہم کا نعرہ سادہ مگر دل کو چھونے والا تھا؛ ''کرایہ، راشن، بسیں، وقار!'' یہ الفاظ کسی فلسفے سے نہیں، بلکہ عام انسان کی روزمرہ جدوجہد سے پھوٹے تھے۔ وہ مساجد میں جاتا، اردو اور عربی میں بات کرتا، یہودی ربّیوں اور اماموں دونوں سے ملاقات کرتا۔ اپنے آپ کو 'ایک مسلم نیویارکر' کہتا ہے، بغیر کسی جھجک کے۔ اُس کے لیے مذہب سیاسی شناخت نہیں بلکہ انسانی پس منظر ہے۔

ان کی انتخابی مہم بالکل ۲۰۱۳ء میں دہلی میں عام آدمی پارٹی کی طرز پر تھی۔ برونکس سے بروکلن تک نوے ہزار رضا کار دروازے کھٹکھٹا رہے تھے، پرچے بانٹ رہے تھے، ووٹروں کو باہر نکلنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ ان کی انتخابی مہم کے دوران کم از کم ۶۲ ارب پتیوں یا اُن کے اہل خانہ نے تقریباً ۲ کروڑ ۸۰ لاکھ ڈالر اُن سیاسی گروپس کو دیے جو ممدانی کو ہرانا چاہتے تھے۔ نیویارک کا میئر بننا کسی معمولی شہر کی قیادت نہیں۔

یہ امریکا کے سب سے بڑے بجٹ اور سب سے متنوع آبادی والا شہر ہے۔ یہاں کی سیاست پورے ملک کے مزاج کی سمت طے کرتی ہے۔ مگر سوال ہے کہ کیا ممدانی نیویارک کو محنت کشوں کے لیے انصاف کا نمونہ بنا پائے گا؟

میرا نائر کے 'سلام بامبے' سے شروع ہونے والا خواب، محمود ممدانی کی فکری تحریروں اور ظہران کی سیاست میں ایک ہی رَو بہہ رہی ہے۔۔۔ انسانی وقار۔

یہ کہانی بتاتی ہے کہ جب ہمدردی عمل میں ڈھل جائے تو جغرافیہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ ایک دہلی کا صحافی جس نے برسوں پہلے سڑکوں پر پلنے والے بے گھر بچوں کی کہانی لکھی تھی، آج اُسی کہانی کا تسلسل نیویارک کے سٹی ہال میں دیکھ رہا ہے۔ ظہران نہ صرف اپنے والدین کا تسلسل ہے، بلکہ اُس یقین کا مظہر بھی کہ وقار ہمیشہ طاقت سے آگے چلتا ہے۔

تاہم، ظہران ممدانی کی فتح جتنی امید جگاتی ہے، اتنا ہی ایک سوال بھی جنم دیتی ہے۔ کیا وہ اس خواب کو برقرار رکھ پائیں گے جس نے لاکھوں عام نیویارکرز کو اُن کے گرد جمع کیا؟

دہلی کی سیاست میں بھی کبھی ایک ایسی ہی تازگی دیکھنے کو ملی تھی۔ جب عام آدمی پارٹی نے کرپشن اور استحصال کے خلاف عوامی لہروں سے جنم لیا۔ اُس وقت بھی نعرہ 'عوام کی حکومت' تھا، بجلی، پانی، اور کرایہ کے وعدے تھے، اور لیڈر تھا ایک عام سا آدمی۔۔۔ اروند کیجریوال۔ مگر وقت کے ساتھ وہ تحریک بھی اقتدار کے بوجھ تلے دب گئی۔ نظریہ مصلحت میں بدل گیا، اور وعدوں کی جگہ حکومتی تنازعات نے لے لی۔

ظہران ممدانی کے سامنے بھی اب یہی امتحان ہے۔۔۔ کہ آیا وہ اپنی تحریک کو نظام کی گرد میں کھوئے بغیر آگے بڑھا پائیں گے؟ کیا وہ سوشلزم کو عوامی خدمت کی سطح پر زندہ رکھ سکیں گے، یا پھر دہلی کی طرح نیویارک بھی ایک دن یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ خواب تو سچا تھا، مگر نظام طاقتور نکلا۔

یہی وہ لمحہ ہے جو طے کرے گا کہ ظہران ممدانی کی سیاست ایک عارضی لہر تھی یا واقعی ایک نئی روایت کا آغاز۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۱۲ نومبر ۲۰۲۵ء)

# عوامی سیاست کا عوام کُش راستہ

**Lisdey Espinoza Pedraza**

آج کی دُنیا میں عوامی طاقت کا غلغلہ ہے۔ ہجوم کی نفسیات ہر جگہ اور ہر معاملے میں کارفرما اور کہیں کہیں کارگر دکھائی دیتی ہے۔ اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بہت سے ممالک اور خِطّوں میں عوامی طاقت نے متعدد بنیادی مسائل حل کرنے میں گلیدی کردار ادا کیا ہے اور لوگوں کو اپنی محرومیوں سے کسی حد تک نجات پانے میں کامیابی نصیب ہوئی ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ عوام کو سڑکوں پر لاکر بھرپور طاقت کا مظاہرہ کرنے سے جمہوری ادارے کمزور پڑتے ہیں۔

چند حالیہ عشروں کے دوران عوامی طاقت کو متحرک کرنے والے رہنماؤں اور سیاسی جماعتوں نے دنیا بھر میں دورِ عروج دیکھا ہے۔ یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ دُور دُور رہنے والی اور صرف اپنے مفادات کی نگرانی تک محدود رہنے والی اَشرافیہ کے پنجوں سے عوام کو بچانے کی بھرپور کوشش کرتی ہے۔

جنوبی امریکا ہو یا مشرقی یورپ یا پھر جنوب مشرقی ایشیا، تمام ہی مقامات پر مُطلق العنان آمروں کا طریقِ کار یکساں ہے۔ ذرائع ابلاغ کو قابو کرو، معاشی اصلاحات کی باتیں کرو اور اشرافیہ کے خلاف بلند بانگ دعوے کرو۔ اقتدار کو مضبوط کرنے کا ان کے نزدیک کوئی اور کارگر طریقہ نہیں۔

عوام کی طاقت کے ذریعے اقتدار کو مضبوط کرنے کا ہتھکنڈا فرانس، اٹلی، پولینڈ، برطانیہ اور جرمنی میں اپنایا جاچکا ہے۔ کہیں معاملہ زیادہ کا ہے اور کہیں کم کا۔ عوام کو متحرک کرکے مظلوم و محروم طبقوں کو اُن کے حقوق دلوائے جاسکتے ہیں۔ جن کی کوئی نہیں سُنتا جب اُنہیں آواز ملتی ہے تب معاملات بہتری کی طرف جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے جمہوریت کو تھوڑی سی توانائی ملتی ہے، وہ تازہ دم دکھائی دینے لگتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عوامی طاقت کے مظاہرے کی بنیاد پر قائم کی جانے اور چلائی جانے والی حکومت کے ہاتھوں جمہوری ادارے کمزور پڑتے جاتے ہیں۔

## عوامیت کی عالمگیر رسائی

عوامیت بنیادی طور پر ایسا نظریہ ہے جو معاشرے کو دو کیمپوں میں بانٹ دیتا ہے۔ ایک طرف ''خالص عوام'' ہوتے ہیں اور دوسری طرف ''کرپٹ اَشرافیہ''۔ عوامیت کی مقبولیت کا مدار صرف ایک نکتے پر ہے۔۔۔ اُن لوگوں کی بات کی جائے جو یہ سمجھتے ہیں کہ سماجی، سیاسی اور معاشی طور پر اُنہیں الگ تھلگ کردیا گیا ہے، محرومی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کردیا گیا ہے۔ امریکا میں چند ایک علاقے ایسے ہیں جو معاشی اعتبار سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور اُن علاقوں کے باشندوں کو ایسا لگتا ہے کہ اُنہیں منصوبے کے تحت نظر انداز کیا گیا ہے۔ یارک شائر میں کان کَنی کے سابق علاقوں کا بھی یہی معاملہ ہے۔ معیشت پیداوار سے خدمات کی طرف چلی گئی

مگر یہ علاقے وہیں کے وہیں رہے۔

جن لوگوں کو یہ احساس ستاتا رہتا ہو کہ اُن سے ناانصافی کی گئی ہے، محروم رکھا گیا ہے، اُنہیں بہکانا اور اُکسانا بہت آسان ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں میں تعلیم کی کمی ہوتی ہے۔ وہ سیاسی طور پر زیادہ جُڑے ہوئے بھی نہیں ہوتے اور اُن میں بے اعتمادی بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ایسے لوگ مرکزی دھارے کے سیاست دانوں کو ایسی اشرافیہ کے طور پر دیکھتے ہیں جس تک پہنچنا آسان نہ ہو۔ خود کو محروم سمجھنے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اُنہیں دانستہ نظرانداز کیا جارہا ہے۔ اشرافیہ جو بیانیہ استعمال کرتی ہے، وہ بھی عوام کی اُمنگوں اور ضرورتوں سے بہت دُور ہوتا ہے۔

دائیں بازو کی سیاست اور ذرائع ابلاغ میں اُس کے بیانیے نے عشروں کے دوران ایک ایسا ماحول پیدا کیا ہے جس میں خود کو ہر اعتبار سے محروم سمجھنے والوں کی تعداد بڑھتی رہی ہے۔ اُنہیں محسوس ہوتا رہتا ہے کہ وہ معاشی اور ثقافتی طور پر مَتروک ہیں۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی یا چھینی ہوئی خوشحالی اور شناخت کی بحالی اور واپسی کے لیے ایسے بیانیے میں بہت کشش محسوس کرتے ہیں جس میں اُن کے حقوق کی بات کی گئی ہو۔

## عوام کی حقیقی آواز

عوام پسند اور عوامی قوّت کے حامل سیاسی رہنما خود کو مظلوم عوام کی حقیقی آواز بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ ریاستی ادارے ایک طرف کھڑے تماشا دیکھتے رہتے ہیں جن سے معاملات بہتر بنانے کی توقع کی جاتی ہے۔

لاطینی امریکا کے بیشتر رہنما عوام کو سُہانے خواب دکھاتے ہیں، جذبات بھڑکاتے ہیں، بھڑکے ہوئے جذبات کے کاندھوں پر سوار ہو کر ایوان ہائے اقتدار تک پہنچتے ہیں۔ پھر یہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ یہی سب کچھ مشرقِ وسطیٰ میں بھی ہوتا رہا ہے۔ مغرب کو لتاڑ کر عوام کے جذبات بھڑکائے جاتے رہے ہیں۔ یورپ کے ''عوامی'' رہنما قوم پرستی کی بات کرتے ہیں، اِشتراکیت کے بعد کی دنیا میں پیدا ہونے والے مسائل کو بنیاد بنا کر عوام کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ ہنگری کے سوویت ماضی سے برطانیہ کے بریگزٹ تک، ہر جگہ شناخت کا بحران ہے اور اِس کی بنیاد پر عوام کو جذباتی کرکے سیاست دان اپنے اُلّو سیدھے کرتے ہیں۔

عوامی سیاست محض بڑھک کا معاملہ نہیں۔ تازہ ترین تحقیق سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ انتہائی تکلیف دہ رجحان ہے۔ کہنے کو یہ کہا جارہا ہے کہ یہ سب کچھ جمہوریت کے احیا کے لیے ہورہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس سے عوام کے کاندھوں پر سوار ہو کر اقتدار کے ایوانوں تک پہنچنے والے لیڈر جو کچھ کر رہے ہیں، اُس کے نتیجے میں جمہوریت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ عوامی طاقت کے بَل پر حکومت کرنے والوں نے چیک اینڈ بیلنس کو جَڑ سے اُکھاڑ پھینکنے والے ہتھکنڈے اپنائے ہیں۔ ایسا دنیا بھر میں ہورہا ہے۔ چیک اینڈ بیلنس ہی سے آزاد معاشرے پنپتے ہیں۔ عوام کو سوال پوچھنے کی آزادی ہوتی ہے۔ وہ کسی بھی معاملے میں حکومت سے جواب طلب کرسکتے ہیں۔ آزاد معاشروں میں عوام سے متعلق ہر معاملے پر کُھل کر بحث ہوتی ہے اور سبھی اپنی اپنی معروضات کُھل کر بیان کرتے ہیں۔

## طریقِ واردات کی یکسانیت

عوام کے کاندھوں پر سوار ہو کر اقتدار کے ایوانوں تک پہنچنے والے لیڈر مختلف اور متنوع سیاسی و ثقافتی پس منظر کے حامل ہوسکتے ہیں تاہم اُن کے طریقِ کار یا طریقِ واردات میں خاصی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ کسی بھی نام نہاد عوامی لیڈر کی ٹول کِٹ میں پہلے نمبر پر ہے معلومات کو کنٹرول کرنا۔ ایسے معاشروں میں مخالفین کی آواز دبانے پر سب سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ عوام کو کُھل کر مشورہ دیا جاتا ہے کہ جو کچھ بھی مِل رہا ہے، اُس سے مطمئن ہوں اور نظامِ حکومت کے خلاف بغاوت کا بالکل نہ سوچیں۔ ایسے معاشروں میں جو بھی حکومت کے خلاف آواز اٹھاتا ہے، اُسے خاموش کردیا جاتا ہے۔ صحافت برائے نام بھی آزاد نہیں رہتی۔ صحافیوں کو پابندِ سَلاسل بھی کیا جاتا ہے۔ اور اگر ضرورت پڑے تو راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹا بھی دیا جاتا ہے۔

## بیانیے کی تشکیل

وینزویلا میں ہیوگو شاویز کے بعد اُس کے جانشین مدورو نے سیاسی و معاشی بحران کے خلاف آواز اٹھائے جانے پر میڈیا کے خلاف کریک ڈاؤن کیا اور مخالفین کو خاموش رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ اِس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ تمام سرکاری حلقوں میں ہر سطح پر ریاست کا منظور کردہ بیانیہ ہی نمایاں اور مقبول رہا۔

یورپ میں بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ مشرقی یورپ کی بیشتر حکومتیں مغربی طرز کی جمہوریت پر زیادہ یقین نہیں رکھتیں۔ چند طاقتور افراد مِل کر کسی کو اپنا سربراہ مقرر کرتے ہیں اور اقتدار پر قبضہ کرلیتے ہیں۔ اُنہیں بظاہر اِس بات کی چنداں پروا نہیں ہوتی کہ ایسا کرنے سے ملک اور عوام کا کیا بنے گا۔ پوری سرکاری یا ریاستی مشینری کو یہ لوگ اپنی مُٹھی میں لے لیتے ہیں۔ سرکاری اور نجی، دونوں ہی ذرائع ابلاغ کو یہ لوگ اپنی مٹھی میں لیتے ہیں تاکہ کسی بھی سطح پر کوئی اختلافی نقطۂ نظر اُبھر اور پَنپ نہ سکے۔

یورپ میں جدید ترین ٹیکنالوجیز کو بروئے کار لایا جارہا ہے۔ پولینڈ کی لا اینڈ جسٹس پارٹی سے فرانس کی نیشنل ریلی تک سبھی سوشل میڈیا کو استعمال کرکے روایتی گیٹ کیپرز کو ایک طرف ہٹا دیتے ہیں۔

عوامی طاقت کے بَل پر اقتدار حاصل کرنے والے بالعموم ایسے ہتھکنڈے اپناتے ہیں جن کے ذریعے رائے عامہ کو اپنی مُٹھی میں لیا جاسکے، اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالا جاسکے۔ سوشل میڈیا پر سینسر شپ بھی عائد کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ اقتدار پر گرفت زیادہ سے زیادہ مضبوط کیا جاسکے۔ یہ تمام ہتھکنڈے جمہوری روایات اور بنیادوں کو کمزور سے کمزور تر کرتے جاتے ہیں۔

## وفاداری کی خریداری

عوامی طاقت کے ذریعے اقتدار حاصل کرنے والوں کی اکثریت نرم معاشی پالیسیوں کے ذریعے وفاداریاں خریدتے ہیں۔ وینزویلا میں ہیوگو شاویز نے بولیوین مشنز کو منظرِ عام پر لاکر صحتِ عامہ، تعلیمِ عامہ اور غریبوں کے لیے رعایتی خوراک سے متعلق کام شروع کیے۔ اِن کاموں سے شاویز کو عوام کی غیر معمولی حمایت حاصل ہوئی۔ جب تیل کی آمدنی ڈگمگانے لگی اور معیشت ڈانواڈول ہونے لگی تب بھی عوام نے شاویز کا ساتھ دیا اور اُسے اپنا حقیقی لیڈر مانتے رہے۔ شاویز کے بعد مدورو نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا یعنی عوام کو بہت سے معاملات میں سَبسڈی دیتا رہا اور غیر معمولی افراطِ زر کے باوجود وہ عوام کو نوازنے میں مصروف رہا۔ وفادار حلقوں کو نوازنا کوئی نئی اور انوکھی روایت نہیں۔ ہنگیری میں اوربان نے اپنے پسندیدہ اور حامی حلقوں کو نوازتے ہوئے بہت سے منصوبے سرکاری فنڈز سے شروع کیے۔ اس دوران اُس نے قومی معیشت کی کیفیت کو بھی نظرانداز کردیا۔ یہ تمام اقدامات پالیسی اور سیاسی رشوت کے درمیان پائی جانے والی حدِ فاصل کو مِٹا کر رکھ دیتے ہیں۔

مشرقی یورپ نے بھی ایشیا اور لاطینی امریکا والا رجحان اپنایا ہے۔ پولینڈ میں جب لا اینڈ جسٹس پارٹی اقتدار میں تھی تب اُس نے فیملی کیش بینیفٹ جاری کیا۔ اِس کے نتیجے میں

دیہی علاقوں میں اُس کی پوزیشن خاصی مستحکم ہوئی۔ مین لینڈ یورپ میں بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ اٹلی میں لیگ اینڈ فائیو اسٹار موومنٹ نے ٹیکسوں میں رعایت دی اور سماجی اصلاحات کا پروگرام شروع کیا۔ برطانیہ میں بریگزٹ کی بات کرنے والوں نے عوام سے وعدہ کیا کہ اُنہیں بہت سے معاشی فوائد سے نوازیں گے اور ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے علاقوں پر خاص توجہ دیں گے۔

جب سرکاری پالیسیاں معیشت اور معاشرت کی مضبوطی پر وفاداری کو ترجیح دیتی ہیں تب عوام زرِ اعانت پر انحصار کرنے لگتے ہیں اور اِس کے نتیجے میں معاشی استقامت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

عوام کے کاندھوں پر سوار ہوکر اقتدار کے ایوانوں تک پہنچنے والے سیاست دان سب سے زیادہ اشرافیہ کو نشانہ بناتے ہیں کیونکہ اُن کے خلاف کی جانے والی ہر بات عوام کو بے حد اپیل کرتی ہے اور وہ بہت متوجہ ہوکر سُنتے ہیں۔ عوام کے حقوق پر ڈاکا ڈالنے کے لیے موردِ الزام ٹھہرائے جانے والے کرپٹ سیاست دانوں، بینکرز اور دانشوروں کے بارے میں کہی جانے والی ہر بات سر آنکھوں پر لی جاتی ہے۔

لاطینی امریکا میں عوامی رہنما بالعموم استعماریت (سامراج) اور مقامی بڑوں کے مذموم ہتھکنڈوں کے خلاف بڑھکیں مار کر اپنے اُلوسیدھے کرتے ہیں۔ شاویز عوام کے سامنے امریکا کو شیطانی ریاست بنا کر پیش کرتا تھا۔ مسلم دنیا میں بھی بہت سے مغربی تہذیب اور ریاستوں کو منفی انداز سے پیش کرکے اپنی مقبولیت کا گراف بلند کرتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ مغربی طاقتوں کے ایجنٹ یا پِٹھّو ہی ہوتے ہیں۔ ہنگیری میں اوربان نے مغربی یورپ کی طرزِ جمہوریت کو منفی انداز سے پیش کرکے اپنے اقتدار کی بنیادیں مضبوط کیں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ مغربی دنیا کے بیشتر ممالک عالمگیریت کے خلاف ہیں اور اِس کے ثمرات سے پسماندہ ممالک کو محروم رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے رہتے ہیں۔ جرمنی اور اٹلی کی سیاسی جماعتیں ترکِ وطن، عالمگیریت اور یورپی یونین کے خلاف متحرک رہتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو قومی خود مختاری کے محافظ کے طور پر پیش کرتی ہیں۔

فیریج نے بریگزٹ کے حوالے سے جو لڑائی لڑی، وہ بھی ایسی ہی کسی تھیم کی بنیاد پر تھی۔ عوام کو کاسموپولیٹن اسٹیبلشمنٹ کے سامنے کھڑا کردیا گیا۔ بعض معاملات میں اپنائی جانے والی بڑھک اگر کسی حد تک قومی مفاد میں ہو، تب بھی معاشرے میں تقسیم تو پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں بہت سے معاملات پر سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں قومی مفادات متاثر ہوتے ہیں۔ عوام کے حق میں کی جانے والی بات بھی عوام کے خلاف چلی جاتی ہے۔ ادارے کمزور پڑتے چلے جاتے ہیں۔ جب ایسا ہو تو کسی معاملے میں سمجھوتا کرنا بھی انتہائی دشوار ہو جاتا ہے یعنی مجموعی طور پر ریاستی ڈھانچے اور معاشرے کو نقصان پہنچ کر ہی رہتا ہے۔

## ماضی کے دُکھ، حال کا اقتدار

عوام کے جذبات ابھار کر اقتدار تک پہنچنے والوں کا ایک بنیادی ہتھکنڈا ہے ماضی کو خاص طور پر نشانہ بنانا۔ لاطینی امریکا میں بیشتر عوامی رہنما نوآبادیاتی دَور کے مظالم کا رَونا رَو کر عوام کے جذبات بھڑکاتے ہیں۔ یہ گویا اُن کے زخم تازہ کرنا ہوا۔ لاطینی امریکا کے طُول و عرض میں سیاست کا معیار یہی ہے۔ عوام کو ماضی کی زِیادتیاں اور مظالم یاد کروا کے سیاسی حمایت اور ہمدردی بٹوری جاتی ہے۔

بہت سے عوامی لیڈر عظمتِ رَفتہ کی بحالی کا عزم دِکھا کر، نئے دَور کے تقاضوں کے مطابق ریاست کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی بڑھکیں مار کر اپنے اقتدار کی بنیادیں مضبوط کرتے رہتے ہیں۔ یورپ کے بیشتر عوامی رہنما اپنے خِطّے کے ماضی کو کھود کھود کر اپنے مطلب کی چیزیں نکالتے رہتے ہیں۔ عوام کی اکثریت ماضی میں رہنا اور ماضی کے بارے میں سُننا پسند کرتی ہے۔ ماضی بھیانک ہو تو اُس سے ڈرایا جاتا ہے اور اگر ماضی شاندار رہا ہو تو اُس کی عظمت کے ترانے گا کر لوگوں کو سبز باغ دِکھائے جاتے ہیں۔ ہر عوامی رہنما اِس بات کی بھرپور کوشش کرتا ہے کہ ماضی سے عوام کا رشتہ نہ ٹوٹے۔

لوگوں کے جذبات بھڑکانے کے لیے جو کچھ بھی کہا جاتا ہے، وہ محض بڑھک پر مبنی مواد نہیں ہوتا بلکہ جامع حکمتِ عملی کا حصہ ہوتا ہے، بھرپور ہتھکنڈا ہوتا ہے۔ ماضی کی غلطیوں کے اِزالے کے لیے دورِ جدید کی پالیسیوں کو اپنا کر عوامی رہنما دراصل موجودہ اداروں کو نشانہ بنانے کا جواز پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ مخالفین کو خاموش کرنے اور خاموش رکھنے کے لیے گڑے مُردے اُکھاڑ کر عوام کو گمراہ کیا جاتا ہے۔

## اداروں پر دباؤ ڈالنے کی رَوش

عوام کی طاقت اور اندھی سیاسی عقیدت کی بنیاد پر قائم ہونے والی حکومتیں جمہوریت کے بیشتر طریقے اپناتی ہیں مگر صرف دِکھاوے کے لیے۔ الیکشن بھی کرائے جاتے ہیں۔ پارلیمنٹ بھی ہوتی ہے اور عدلیہ بھی مگر رُوح سے خالی۔ تمام جمہوری ادارے یکسر بے جان اور محض ربر اسٹیمپ ہوتے ہیں۔ عوامی رہنما عدالتوں میں اپنی پسند کے لوگوں کو جج کے منصب پر فائز کرتے ہیں تاکہ اُن سے اپنی مرضی اور مفاد کے مطابق فیصلے کروائے جاسکیں۔ عوامی طاقت کے بل پر اقتدار پانے والے لیڈر بالعموم تمام ہی بنیادی ریاستی اداروں کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کے لیے اُن میں اپنے لوگ بھرتی کرتے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں معاملات صرف خرابی کی طرف جاتے ہیں۔ انتخابی قوانین میں اپنی مرضی کے مطابق ترامیم کروائی جاتی ہیں۔ انتخابی طریقِ کار اور وقت بھی اپنی مرضی کے مطابق طے کیا جاتا ہے۔ انتخابی عملے میں بھی اپنے لوگ رکھے جاتے ہیں تاکہ مرضی اور ضرورت کے مطابق دھاندلی کروائی جاسکے، بے ضابطگیوں کا بازار گرم کروایا جاسکے۔ یہ رہنما جمہوریت کے نام پر ایسا بہت کچھ کرتے ہیں جس سے جمہوریت بدنام ہوتی ہے اور لوگ اِس طرزِ حکومت سے مُتنفّر سے ہو جاتے ہیں۔

پولینڈ کی حکومت عدالتی اِصلاحات کے حوالے سے کئی بار یورپی یونین سے مُتصادم ہوئی ہے۔ ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ جب بھی ریاستی ادارے کسی حکمران کے خلاف کوئی دُرست کارروائی کرتے ہیں، تب وہ اُن اداروں ہی کو موردِ الزام ٹھہرانے لگتا ہے، اُنہیں رُسوا کرنے پر تُل جاتا ہے۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ایک اور بڑی اور عجیب مثال قائم کی ہے۔ امریکا میں جمہوری اداروں کے مستحکم ہونے پر کِسے شک ہے؟ امریکی معیشت کے لیے بحران اُبھرتے رہتے ہیں تاہم سیاسی سطح پر کچھ خاص اُتھل پُتھل نہیں پائی جاتی۔ ڈونلڈ ٹرمپ کو یہ 'اعزاز' حاصل ہے کہ اُنہوں نے موقع ملتے ہی ریاستی اور دیگر اداروں کو محض لتاڑا ہی نہیں ہے بلکہ اُن کی وُقعت کم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انہوں نے میڈیا کی آزادی پر ضَرب لگائی ہے اور ۲۰۲۰ء کے صدارتی انتخابی نتائج کو متنازع ٹھہرانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہ سب کچھ اُنہوں نے ایسی حالت میں کیا کہ جب امریکا میں تمام ریاست اور جمہوری ادارے پوری قوّت کے ساتھ موجود ہیں اور اپنے حصّے کا کام بھرپور طریقے انجام بھی دے رہے ہیں۔ اِس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب کسی ریاست میں جمہوری اور ریاستی ادارے کمزور ہوں تو عوامی طاقت کے بَل پر کوئی بھی کسی طرح کا کھیل بہت آسانی سے کھیل سکتا ہے۔

دنیا بھر میں عوامی لیڈروں کا ایک معروف طریقِ کار یہی

تو ہے کہ بھرپور انداز کی آمریت کو جمہوری لِبادے میں پیش کرو، لوگوں کو یقین دِلاؤ کہ جو کچھ بھی کیا جارہا ہے، وہ اُن کی حکمرانی مضبوط کرنے کے لیے کیا جارہا ہے۔ عوام کو بار بار یقین دلایا جاتا ہے کہ اقتدار کا سرچشمہ وہی تو ہیں یعنی وَوٹ کے ذریعے جو رائے دی جائے گی، اُسی کی بنیاد پر حکومت قائم ہوگی اور اُسی کے ذریعے سب کچھ چلے گا یا چلایا جائے گا۔

## اَب آگے کیا ہونا ہے؟

دُنیا بھر میں عوام کے جذبات بھڑکا کر سیاسی فوائد بٹورنے اور اقتدار کے ایوانوں تک پہنچنے کی رَوش تیزی سے عام ہورہی ہے۔ سیاست دانوں نے اَب وَوٹ کی طاقت پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کو سڑکوں پر لاکر جمہوری اداروں کو کمزور کریں اور انتخابات میں اپنی مرضی کے نتائج آسانی سے حاصل کریں۔ عوام کو سڑکوں پر لانے والے سیاست دان بالعموم غیر معمولی ذہنیت اور صلاحیّت کے حامل نہیں ہوتے۔ دنیا بھر میں جمہوری اداروں کے لیے مشکلات بڑھ رہی ہیں اور بعض مُما لک میں تو جمہوریت کو ہلاکت خیز قِسم کے بُحران کا سامنا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عوامی انداز کی سیاست بہت سے معاملات کو اُچھالتی ہے۔ حقوق غَصب کرنے والوں کو بے نقاب بھی کرتی ہے، محروم عوام کو حوصلہ بھی دیتی ہے اور سیاسی بحالی کی راہ بھی ہموار کرتی ہے مگر دوسری طرف ایسا بھی تو ہے کہ اِس کے ہاتھوں آمرانہ طرزِ حکومت تیزی سے پروان چڑھتی ہے۔ عوام کے کاندھوں پر چڑھ کر سیاست کرنے والے جب اقتدار کے ایوانوں تک پہنچتے ہیں تو آمریت کے طور طریقے اپنانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتے۔

عوامی طاقت کے ذریعے حکومت قائم کرکے آمریت اپنانے والوں کو کوئی طاقت للکار سکتی ہے تو وہ صرف ذرائع ابلاغ ہے۔ یہی سبب ہے کہ عوامی راہنما اپنی آمرانہ و جابرانہ طرزِ حکومت کی بقا یقینی بنانے کے لیے ذرائع ابلاغ کا گلا گھونٹنے پر تُلے رہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مین اِسٹریم اور سوشل میڈیا کے ذریعے عوام کو شعور بخشا جاسکتا ہے، وہ اپنے حقوق کے لیے کسی بھی وقت کھڑے ہوسکتے ہیں۔

دنیا بھر میں عمومی یا روایتی سیاسی جماعتیں کبھی کبھی عوامی انداز اختیار کرکے مقبولیت کا گراف بلند کرنے کی کوشش کرتی ہیں مگر ایسا کرنے میں اچھے خاصے خطرات مُضمر ہیں۔ عوامی طاقت پر پلنے اور کسی نہ کسی طور اقتدار پر قابض ہونے کی شدید خواہش رکھنے والی سیاسی جماعتوں کی نقّالی انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ ایسا کرنے سے جمہوریت مکمل طور پر حالتِ نزع کا شکار ہوسکتی ہے۔ وہی سیاست اصل اور قابلِ قبول ہے، جس میں سب کو قبول اور تسلیم کیا جائے، مخالفین کو بھی احترام کی نظر سے دیکھا جائے اور اختلافی نقطۂ نظر کی توقیر کا اہتمام کیا جائے۔ مخالفین کو دشمن یا مُنحرفین سمجھا جائے۔ برطانیہ، فرانس اور امریکا جیسے بڑے جمہوری ممالک میں بھی عوامی طاقت کے ذریعے انتہائی دائیں بازو کی طرف جھکاؤ ممکن بنادیا گیا ہے۔ اِس معاملے میں احتیاط لازم ہے۔

اگر عوامی اندازِ سیاست کے شدید نقصانات سے بچنا ہے تو تمام ریاستی اداروں کو مضبوط بنانے کے بارے میں سوچتے رہنا ہوگا۔ عدلیہ خودمختار ہونی چاہیے، اُس پر کسی بھی طرح کا دباؤ نہیں ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ انتخابی نظام بھی بالکل شفّاف اور مؤثر ہونا چاہیے۔ انتخابی عمل میں کسی کی بھی مداخلت کسی صورت برداشت نہیں کی جانی چاہیے۔ یورپی یونین نے پولینڈ اور ہنگری کے کیس میں ثابت کردیا ہے کہ اگر مؤثر طریقے سے دباؤ ڈالا جائے تو جمہوریت سے گُریز کی راہ پر گامزن حکومتوں کو بھی عدالتی اور انتخابی اِصلاحات کی طرف لے جایا جاسکتا ہے۔

اگر عوام کو بروقت سیاسی خواندگی سے ہمکنار کیا جائے، اُنہیں بتایا جاتا رہے کہ دُنیا بھر میں صرف وہی ممالک ترقی کر پائے ہیں اور خوشحال ہو پائے ہیں جنہوں نے جمہوریت کو اُس کی روح کے ساتھ اپنایا ہے اور آمرانہ طور طریقوں سے یکسر گُریز کیا جائے۔ عوام کو اندازہ ہونا چاہیے کہ آمرانہ طرزِ حکومت سے چند افراد کا بھلا ہوتا ہے اور اگر ملک بھرپور ترقی بھی کرے تو ثمرات عوام تک نہیں پہنچتے کیونکہ ایک خاص طبقہ ہی تمام معاملات اور تمام وسائل پر قابض ہو رہتا ہے۔ محض بڑھک اور نعرے بازی کی بنیاد پر کوئی بھی سیاسی نظام جامع طور پر کامیاب نہیں ہوسکتا۔

ایسا نہیں ہے کہ عوامی انداز کی سیاست صرف شَر پر مبنی ہے۔ یہ بنیادی طور پر عوام کی شکایات کے بَل پر پروان چڑھتی ہے۔ ہاں، آمرانہ سوچ رکھنے والے حکمران اِسے اپنی پلے بُک میں تبدیل کردیتے ہیں۔ اگر ریاستی اداروں کو مضبوط کیا جائے۔ شہریوں کو اختیارات دیے جائیں اور اُن کے حقیقی مسائل حل کرنے پر توجہ دی جائے تو معاشروں کو عوامی سیاست کے مثبت اثرات سے ہمکنار کیا جاسکتا ہے۔

جمہوریت کو پروان چڑھانے میں تعلیم کا کردار بہت اہم ہے۔ عوام پڑھے لکھے ہوں تو بہت سے معاملات کو اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ پڑھے لکھّے ہونے کی صورت میں عوام بڑھک اور حقیقی سیاسی عزم کے فرق کو زیادہ آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ اس حوالے سے عالمگیر سطح پر تعاون اور اشتراکِ عمل کی بھی بہت اہمیت ہے۔ اداروں کی اصلاح کے ذریعے اُن کے درمیان زیادہ سے زیادہ تعاون کی راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔

دوسرے، بہت سے معاملات کی طرح جمہوری اداروں کو بھی نگہداشت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اُن میں پیدا ہونے والا بگاڑ روکنے کے لیے لازم ہے کہ عوام کی شکایات پر دھیان دیا جائے، جمہوری اداروں میں پائی جانے والی خامیوں، خرابیوں اور کمزوریوں کو دُور کیا جائے۔ ایسا اُسی وقت ہوسکتا ہے جب نگرانی کا نظام مَعقول ہو اور کام بھی کر رہا ہو۔

کیا ہم عوامی طرز کی سیاست کو اِس بات کی اجازت دیں گے کہ ہمارے مستقبل سے کھیلے یا پھر ہم اپنے اجتماعی عزم کو متحرک کریں گے اور جمہوریت کو مکمل ناکامی سے بچانے کے لیے تمام دستیاب وسائل کو بروقت اور تدبّر سے بروئے کار لائیں گے؟ حتمی تجزیے میں ہماری جمہوریت کی تقدیر تو پورے معاشرے ہی کے ہاتھ میں ہے۔

(مترجم: ابوصباحت)

"Reclaiming democracy: The dangerous playbook of modern populists".
("The Globalist". July 29, 2025)

## بقیہ: غزہ امن معاہدہ: امکانات اور خدشات

ہم نے اس مشن کا نام ''طوفان الاقصیٰ'' (Al Aqsa Flood) اسی لیے رکھا کہ ہمارا مقصد صرف غزہ و فلسطین کی سرزمین نہیں، بلکہ ہمارا مقصود ''مسجدِ اقصیٰ'' کی دوبارہ بحالی ہے، جس کے لیے ان شاء اللہ ہم ہر طرح کی قربانی پیش کرنے کے لیے حاضر ہیں۔

یہ عارضی جنگ بندی ایک امید کی کرن ہے۔ مگر اصل فتح وہی ہے جب غزہ کی عوام کو مکمل آزادی، بحالی اور بنیادی حقوق میسر ہوں گے (ان شاء اللہ)۔ ہمیں ایک متحد، باشعور اور پُرعزم امّت کی طرح اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے امن اور انصاف کے حصول تک جدوجہد جاری رکھنی ہے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ مجاہدین کی قربانیوں کو قبول فرمائے، اور ہمیں دشمنانِ اسلام کا آلہ کار بننے سے محفوظ فرمائے۔ آمین!

# ایران آبی بحران کی زَد میں

پانی کا بحران عالمگیر ہے یعنی کوئی بھی ملک اِس سے بچا ہوا نہیں۔ ترقی یافتہ دنیا میں ہمیں عمومی سطح پر پانی کا بحران دکھائی نہیں دیتا تاہم اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ پانی سمیت تمام بنیادی سہولتوں کی فراہمی کا تسلسل برقرار رکھنے کے لیے اُنہیں بہت زیادہ فنڈنگ کرنا پڑتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی وبا کی روک تھام کے لیے غیر معمولی پیمانے پر اخراجات کی منزل سے گزرنا پڑے۔

ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں پانی کا بحران زیادہ سنگین اور مشکلات پیدا کرنے والا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پانی اور دیگر بنیادی چیزوں یا سہولتوں کا بحران حکومت کی بنیادیں ہلا دیتا ہے۔ پسماندہ ممالک کی حکومتیں بنیادی سہولتوں کی فراہمی کا ڈھانچا بہتر بنانے کے لیے فعال رہتی ہیں کیونکہ اِس حوالے سے دشواریوں کا سامنا ہونے پر لوگ مشتعل ہو جاتے ہیں اور شدید بے چینی کے اظہار کے نتیجے میں سیاسی انتشار بھی پھیلتا ہے۔

ایشیا کے جن ممالک میں اِس وقت پانی کا بحران خطرناک نوعیت کا ہے، اُن میں ایران بھی شامل ہے۔ ایرانی حکومت بھی اس حوالے سے بہت پریشان ہے کیونکہ معاملہ دن بہ دن بگڑتا ہی جارہا ہے۔ ایران کے بیشتر علاقوں میں کئی سال سے ایک طرف تو غیر معمولی نوعیت کی خشک سالی ہے اور دوسری طرف پانی کی تقسیم و ترسیل کے معاملات پر حکومت کا معقول تصرف نہیں رہا۔ بدانتظامی نے پانی کے بحران کو مزید وسعت دی ہے۔

ایران کم و بیش پانچ سال سے غیر معمولی خشک سالی کا سامنا کر رہا ہے۔ وسیع البنیاد خشک سالی کے ہاتھوں ملک کا اچھا خاصا رقبہ بنجر ہو چکا ہے، صحرا کی سی ہیئت اختیار کر چکا ہے۔ اِس کے نتیجے میں معیشت بھی متاثر ہوئی ہے اور معاشرت بھی۔ پانی کی شدید قلت کے باعث ایک طرف تو ایران میں زرعی شعبہ متاثر ہوا ہے اور دوسری طرف صنعتوں کے لیے بحرانی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ جن صنعتی یونٹس کو زیادہ پانی درکار ہوتا ہے، اُن کا پیداواری عمل برقرار رکھنا دشوار تر ہوتا جارہا ہے۔

ایران کی آبادی ۹ کروڑ نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ سال بھر میں کم و بیش ۱۰۰ ارب مکعب میٹر پانی استعمال کرتے ہیں۔ اب لوگوں کو ضرورت سے کہیں کم پانی مل پارہا ہے جس کے نتیجے میں اُن کی مشکلات بڑھی ہیں۔

ایران میں زراعت کے لیے کل رقبے کا صرف ۱۲ فیصد زیرِ استعمال ہے تاہم اِسے ملک کے مجموعی ذخیرے کا ۹۰ فیصد پانی درکار ہوتا ہے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کئی اہم فصلیں متاثر ہوتی ہیں۔ ایران میں یہی ہو رہا ہے اور بعض چیزوں کی پیداوار گھٹ گئی ہے۔

ایرانی حکومت اِس بات کو اچھی طرح سمجھتی ہے کہ اُسے پانی کے بحران کو مزید بگڑنے سے پہلے ہی کنٹرول کرنا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو معاملات بگڑیں گے۔

ایران میں بارشیں سالانہ اوسط سے خاصی کم ہو رہی ہیں اور ملک کے بیشتر حصوں میں پائی جانے والی خشک سالی کے باعث پانی کے ذخائر پر دباؤ بھی بڑھ رہا ہے۔ ملک کے بیشتر حصوں میں شدید گرمی پڑنے لگی ہے۔ درجہ حرارت ۵۰ سینٹی گریڈ سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں پانی کے ذخائر کا حجم گھٹتا جارہا ہے کیونکہ شدید گرمی پڑنے کی صورت میں پانی بخارات کی شکل میں زیادہ تیزی سے اُڑتا ہے۔ گزشتہ برس ایران میں بارش کے پانی کا ۷۰ فیصد بخارات بن کر اُڑ گیا۔ دوسری طرف ترکیہ میں یہ خسارہ ۵۰ فیصد تھا۔ ترکیہ پڑوسی ہے، اس لیے ایران کے لوگ بیشتر معاملات میں اپنا اور ترکوں کا موازنہ کرتے ہیں اور حکومت پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ وہ ترک حکومت کی طرح حکمرانی کا بلند معیار یقینی بنائیں۔ ترکیہ کی آبادی ایران سے کم ہے اور وہاں بیشتر معاملات قابو میں ہیں۔

ایرانی حکومت کے لیے ایک بنیادی مسئلہ یہ بھی ہے کہ مخالفین کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ ایسے میں حکمرانی کا معیار بلند کرنے کے حوالے سے دباؤ بڑھ رہا ہے۔ مخالفین اور منحرفین چاہتے ہیں کہ کوئی بڑا ایشو ہاتھ آجائے تاکہ وہ حکومت کو گرانے کا عمل تیز کریں۔

ایران میں بنیادی مسائل کے حوالے سے پہلے بھی بحرانی کیفیت پیدا ہوتی رہی ہے۔ بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے نظام میں پائی جانے والی خرابیوں کو اُچھال کر مخالفین اور منحرفین حکومت کے لیے مشکلات پیدا کرتے رہے ہیں۔ حکومت پر اِس حوالے سے شدید دباؤ ہے۔

ایران کی حکومت نے پانی کے بحران پر قابو پانے کے لیے انقلابی اقدام کے طور پر افغانستان، ترکمانستان، تاجکستان اور ازبکستان سے بڑے پیمانے پر پانی درآمد کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اِس حوالے سے بات چیت بھی ہو رہی ہے۔ اِس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایرانی حکومت کو پانی کے بحران کی مجموعی کیفیت کا کتنی شدت سے احساس ہے۔

ایرانی حکومت کو بخوبی اندازہ ہے کہ حکمرانی کے گرتے ہوئے معیار اور بنیادی سہولتوں کے حوالے سے انتظامی نااہلی کو بنیاد بنا کر حزبِ اختلاف کسی بھی وقت کوئی بڑی تحریک چلا سکتی ہے۔ ایرانی حکومت نے صورتحال کی سنگینی کے پیشِ نظر نصف صوبوں کو آبی بحران سے دوچار قرار دے رکھا ہے۔ یہ اقدام اِس لیے لازم ہو چکا تھا کہ معاملات کو تیزی سے درست کرنا ہے۔

اِس وقت تہران کی ضرورت پوری کرنے والے ڈیم اپنی گنجائش کے صرف ۱۴ فیصد کی حد تک بھرے ہوئے ہیں۔ پانی کی اِس شدید قلت نے معیشت اور معاشرت، دونوں کے لیے غیر معمولی نوعیت کے مسائل پیدا کیے ہیں۔ پانی چونکہ انتہائی بنیادی چیز ہے، اِس لیے اِس کے بحران نے ایرانیوں کی اکثریت کو مضطرب کر رکھا ہے۔

یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ایران میں پانی کا بحران کچھ تو قدرتی ماحول کا پیدا کردہ ہے اور کچھ حکومت کی نااہلی یا بدانتظامی کا بھی نتیجہ ہے۔ عوام بھی اس بات کو سمجھتے ہیں کہ حکومت نے بعض معاملات میں ڈھیل برتی ہے جس کے نتیجے میں معاملات بگڑے ہیں۔ حکومت بھی سمجھتی ہے کہ اِس حوالے سے عوام میں اضطراب بڑھ رہا ہے۔ چند برس قبل بھی ایسے ہی مسائل کو بنیاد اور جواز بنا کر اپوزیشن نے حکومت کا ناک میں دم کیا تھا۔ تب چلائی جانے والی تحریک اِس قدر طاقتور تھی کہ حکومت واضح طور پر ڈگمگا گئی تھی۔ اب حکومت اپوزیشن کو ایسا کوئی بھی موقع دینا نہیں چاہتی۔ اِس کی ایک ہی معقول صورت ہے۔۔۔ یہ کہ حکومت بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کے نظام کو بہتر بنانے پر متوجہ رہے اور ایرانی حکومت ایسا ہی کر رہی ہے۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Iran: Water crisis as regime crisis".
("The Globalist". July 30, 2025)


اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب
"The Wastes of Time" کا اردو ترجمہ
شکستِ آرزو
(جب پاکستان دولخت ہوا)
پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد حسین
صفحات: ۳۵۲ --- قیمت: ۷۰۰ روپے
اکیڈمی بک سینٹر فون: 021-36368020

# دہشت گردی، ایک رُخ یہ بھی!

آصف محمود

کیڈٹ کالج پر حملہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی اسلام آباد میں کچہری کے باہر دھماکا ہو جاتا ہے۔ دہشت گردی کی ایک نئی لہر دستک دے رہی ہے۔ اس پر ہمارے ہاں بالعموم طالبان اور بھارت کے تناظر میں بات ہوتی ہے تاہم ایک پہلو اوجھل رہ جاتا ہے جو انتہائی اہم ہے۔

وہ پہلو افغانستان میں چھوڑے گئے امریکی اسلحے کا ہے۔ امریکا سے یہ تو پوچھا جائے کہ جب تم گئے تو اس وقت تو ابھی کوئی باقاعدہ حکومت وہاں موجود نہیں تھی۔ طالبان نے بھی ابھی مکمل اقتدار نہیں سنبھالا تھا تو یہ اسلحہ تم نے کس کو دیا، کن گروہوں کو دیا اور کیوں دیا؟ نیز یہ کہ یہ اسلحہ تم نے وہاں چھوڑا ہی کیوں؟ یہ غلطی تھی یا کوئی اہتمام تھا؟ غلطی تھی تو یہ کیسے ہوگئی؟ اہتمام تھا تو یہ کس کے خلاف تھا؟ کیا پاکستان کے خلاف تھا؟

زیادہ تر اسلحہ تو یقیناً طالبان حکومت ہی نے کنٹرول میں لے لیا ہوگا لیکن کون کیا جانے اسلحہ کتنا تھا اور کس کس گروہ اور تنظیم کے پاس ہے۔

امریکا افغانستان میں جلدی سے نکلا۔ اس جلدی میں امریکا جاتے جاتے افغانستان میں جو اسلحہ اور فوجی ساز و سامان چھوڑ گیا، اس کی مالیت ۷؍ارب ڈالر سے زیادہ ہے۔ یاد رہے کہ پاکستان کا کُل دفاعی بجٹ ۶؍ارب ڈالر ہے۔ یعنی پاکستان کے کُل دفاعی بجٹ سے زیادہ مالیت کا اسلحہ اور فوجی ساز و سامان امریکا افغانستان میں چھوڑ گیا۔

چھوڑ کر کیوں گیا اور اگر چھوڑ کر جانا ہی تھا تو طالبان کی نئی حکومت کے حوالے کر جاتا تاکہ پتا تو چلتا اسلحہ ہے کیا کچھ اور کس کے پاس ہے۔ ابھی تو کسی کو علم ہی نہیں کون کون سا اسلحہ کس کس گروہ کے پاس ہے۔

تھوڑا بہت اسلحہ ہو تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ جاتے جاتے چھوڑ دیا۔ لیکن جب اس اسلحے اور فوجی ساز و سامان کی مالیت ۷؍ارب ڈالر ہو تو پھر معاملہ اتنا سادہ نہیں رہتا۔ سوال وہی ہے: امریکا اتنا زیادہ اسلحہ افغانستان میں کیوں چھوڑ گیا؟ اس کی وجہ؟ اس کی حکمت؟ یہ معاملہ کیا ہے اور یہ کھیل کیا ہے؟

پینٹاگون کی جانب سے امریکی کانگریس کو جمع کرائی گئی رپورٹ کے مطابق امریکا افغانستان میں ۷؍اعشاریہ ۲؍ارب ڈالر مالیت کا فوجی ساز و سامان چھوڑ کر گیا ہے جس میں جہاز، ہیلی کاپٹر، گولہ بارود، نائٹ ویژن چشمے اور بائیومیٹرک ڈیوائسز شامل ہیں۔

امریکی محکمہ دفاع کی رپورٹ کے مطابق امریکا افغانستان میں ۷۸ ہیلی کاپٹر اور جنگی جہاز چھوڑ گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ اڑان بھر کر واپس نہیں جا سکتے تھے؟ ان کو چھوڑ جانے میں کیا حکمت تھی؟

'الجزیرہ' کی رپورٹ کے مطابق طالبان کو افغانستان میں ۶۱ ہزار امریکی فوجی گاڑیاں، ۳؍لاکھ لائٹ ویپن (چھوٹی مشین گنیں اور رائفلیں وغیرہ) اور ۲۶ ہزار ہیوی ویپن ملے ہیں۔ تعداد پر غور فرمائیے اور امریکا کے لائٹ اور ہیوی ویپن کی تفصیل دیکھ لیجیے۔ یہ اتنا بھاری اسلحہ ہے جو دنیا کے بہت سارے ممالک کی افواج کے پاس نہ ہو۔ یہ اسلحہ کیا کوئی اپنے دشمن کے پاس غلطی سے چھوڑ کر جاتا ہے؟ یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں کہ امریکا جیسی قوت افغانستان سے نکلے اور اپنا بھاری اسلحہ وہیں چھوڑ جائے۔

ہالی وڈ کی فلموں میں بھی یہ اہتمام موجود ہوتا ہے کہ کہیں سے امریکا کو اچانک بھاگنا پڑے تو اس کے فوجی اسلحہ ساتھ لے جاتے ہیں یا اسے ضائع کر دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کیا امریکا کی فوجی قیادت ہالی ووڈ کے پروڈیوسروں سے بھی فارغ العقل تھی کہ وہ جاتے ہوئے اپنا بھاری اسلحہ وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ نہ ساتھ لے جا سکی نہ ہی اسے تباہ کر سکی؟

ظاہر ہے یہ غلطی نہیں ہے۔ یہ اہتمام ہے اور بادی النظر میں اس اہتمام کا نشانہ پاکستان ہے۔ امریکا افغانستان سے ایک معاہدہ کر کے نکلا۔ ایسا نہیں کہ رات کو اس کے فوجی سو رہے ہوں اور انہیں اچانک بھاگنا پڑا ہو۔ جب آپ معاہدہ کر کے نکلتے ہیں تو آپ اپنا ساز و سامان ساتھ لے جانے کا انتظام بھی کرتے ہیں۔ امریکا نے یہ انتظام کیوں نہیں کیا؟ ڈھنگ کا انتظام نہیں کر سکا تو جو اسلحہ وہ چھوڑ کر جا رہا تھا اسے تباہ کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ چند منٹ؟ وہ یہ کام بھی نہ کر سکا۔

اب جب ہم دن میں اٹھارہ اٹھارہ فوجیوں کی لاشیں اٹھا رہے ہیں، ہمیں سوچنا ہوگا کہ کیا یہ سب ایک غلطی تھی، اتفاق تھا یا یہ ایک اہتمام تھا کہ اسلحہ چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ پاکستان کے خلاف استعمال ہو سکے۔ 'فارن پالیسی' میگزین کے مطابق امریکا کا چھوڑا گیا یہ اسلحہ بلیک مارکیٹ میں بھی دستیاب ہے۔

سب سے زیادہ مانگ امریکا کی ایم۔۴ سالٹ رائفل ہے۔ یہ وہی رائفل ہے جو اس وقت پاکستان کے خلاف بلوچستان میں استعمال ہو رہی ہے۔ معاملہ صرف اس ایک رائفل کا نہیں ہے، پاکستان کی پریشانی یہ ہے کہ بلوچستان میں جو عناصر دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہیں ان کے پاس اب وہی اسلحہ ہے جو امریکا افغانستان میں چھوڑ کر گیا۔

پاکستان کے خلاف اس دورانیے میں دہشت گردی کی کارروائیوں میں اضافہ ہوا ہے تو یہ بے سبب نہیں، اس میں امریکا کے چھوڑے ہوئے اس اسلحے کا اہم کردار ہے۔ امن عامہ کے چیلنج کے سامنے پہلی دیوار پولیس کی ہوتی ہے اور پولیس کے سامنے جب سپر پاور کے اسلحے سے لیس عناصر ہوں تو پولیس کے لیے اس سے نبٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ اتفاق نہیں ہے کہ امریکا کے جانے کے کچھ عرصہ بعد دہشت گردی بڑھنے لگی۔ گزشتہ سال بلوچستان میں دہشت گردی کے سب سے زیادہ واقعات ہوئے۔ بلوچستان حکومت کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق اس ایک سال میں دہشت گردی کے ۵۵۵؍واقعات میں ۳۰۰ لوگ جاں بحق ہوئے جن میں عام شہری، پولیس اہلکار اور فوجی شامل ہیں۔

پاکستان کے لیے اب یہ بہت بڑا چیلنج بنتا جا رہا ہے کہ اس ساری صورتِ حال سے کیسے نبٹا جا سکے۔ پاکستان کے لیے اس پر خاموش رہنا ممکن نہیں رہا۔ ایک ایک دن میں اگر ہمارے ۱۸، ۱۸؍نوجوان شہید ہونے لگیں تو اس پر ریاست خاموش رہ بھی کیسے سکتی ہے۔ اب تو روز حملے ہو رہے ہیں۔

امریکا کے اپنے ادارے اب اعتراف کر رہے ہیں کہ اس کا چھوڑا ہوا یہ اسلحہ اس پورے خطے کو کسی الاؤ میں دھکیل سکتا ہے۔ اسلحے کی نئی بلیک مارکیٹ وجود میں آجانے کی باتیں بھی پاکستان نہیں، مغربی ممالک اب خود کر رہے ہیں۔ ان ہی ممالک کے غلط فیصلے ہوتے ہیں جن کا تاوان ہم جیسے ممالک کو دینا پڑتا ہے۔

امریکا سے ہر فورم پر یہ سوال ہونا چاہیے کہ ۷؍ارب ڈالر سے زیادہ مالیت کا یہ اسلحہ جو تم چھوڑ گئے، یہ غلطی تھی، اتفاق تھا یا اس میں کوئی اہتمام تھا؟ پاکستان میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی کے پیچھے اس اسلحے کا کیا کردار ہے، اس پر بھی غور ہونا چاہیے اور اس پر بھی بات ہونی چاہیے۔

(بحوالہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی۔ ۱۳؍نومبر ۲۰۲۵ء)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950